بکھرے اوراق
(ناول)
عبدالصّمد

بکھرے اوراق

(ناول)

عبدالصّمد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶

BIKHRE AURAAQ

(Novel)

by

Abdussamad

Year of Edition 2010
ISBN 978-81-8223-684-4

Price Rs. 150/-

نام کتاب	بکھرے اوراق (ناول)
مصنف	عبدالصمد
پتہ	۲۱۲، اے۔ رجنی گندھا، صداقت آشرم، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۱۰
سنِ اشاعت	۲۰۱۰ء
تعداد	۶۰۰
کمپوزنگ	شہناز بانو، شاہ کی املی، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۸
قیمت	۱۵۰ روپے
مطبع	آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

○ پروفیسر عتیق اللہ کے نام

O

وہ ایک عجیب بستی تھی۔

عجیب ان معنوں میں نہیں کہ سورج وہاں پچھّم سے نکلتا تھا اور پورب میں ڈوبتا تھا بلکہ ان معنوں میں کہ اس بستی کا اور چھور آج تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ یہاں کے لوگوں کے مزاج کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ جو آج ہنس کر مل رہا ہے، کوئی ضروری نہیں کہ کل وہ مسکرا کر بھی ملے، ہوسکتا ہے وہ ایک نگاہ غلط انداز بھی نہ ڈالے، ہوسکتا ہے وہ پاس سے گزر جائے اور اس کی آنکھوں میں پہچان کی ایک رمق بھی پیدا نہ ہو، اور وہ بالکل اجنبی بن جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے انداز میں دوستانہ برتاؤ تو دور کی بات، دشمنی کے طور طریقے کی جھلک دکھائی دے۔

وہ اس بستی میں بہت دنوں سے رہتا آیا تھا۔ اتنے دنوں سے کہ اب اسے خود یاد نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ نہیں بلکہ اس کے باپ دادا یہاں رہتے آئے تھے، اس کے باپ دادا کے بھی باپ دادا۔ کوئی کہتا تھا کہ وہ دور دراز کے کسی علاقے سے بھاگ کر آئے تھے۔ کوئی کہتا کہ کسی نامعلوم جنگ میں اس کے قبیلے کو شکست ہوگئی تھی اور سارے

کا سارا قبیلہ جان بچا کر وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ کوئی کہتا کہ وہ تجارت کے سلسلے میں دور دراز کا سفر کرتے تھے، اس لئے یہاں بھی آئے، جگہ اچھی تھی، یہیں کے ہو رہے۔ غرض طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔ آنکھوں دیکھی بیان کرنے والا کوئی موجود نہیں تھا اس لئے جو جیسی سنتا یقین کر لیتا۔ کچھ لوگ اپنے مزاج اور رجحان کے مطابق باتوں کو قبول کرتے اور اسی کے مطابق رویے اختیار کر لیتے۔

اس نے بات کی جڑ تک پہنچنے کی خود بہت کوشش کی لیکن اس کا بھی وہی حال ہوا، وہ بھی کبھی 'الف' کو قبول کر لیتا کبھی 'ب' کو۔ مشکل اس وقت ہوتی جب وہ کبھی 'الف' پر اپنے تیقن کی دبیز چادر چڑھا کر مطمئن ہو جاتا تو 'ب' بہت بے دردی سے اس چادر کو نوچ کر پھینک دیتا اور خود اپنی لائی ہوئی چادر اوڑھ کر بیٹھ جاتا۔ مجبوراً اسے بھی 'ب' ہی کو اپنے یقین کا مرکز بنانا پڑتا۔ مشکل اس وقت اور بڑھ جاتی جب کبھی دونوں پر سے اس کا یقین اٹھ جاتا اور اس کے پاس کوئی تیسرا متبادل بھی موجود نہیں رہ جاتا۔ اس کا جی چاہتا کہ اپنے بالوں کو نوچ ڈالے، کپڑوں کو تار تار کر ڈالے، سامنے پڑی ہوئی ساری چیزوں کو ٹھوکروں سے اڑا دے، آس پاس کی ساری چیزوں میں آگ لگا دے، اپنے وجود کو مٹا دے، فنا کر دے ہمیشہ کے لئے ...... تمام سوچیں اس کے اندر اندر گھٹتی رہتیں یہاں تک کہ وہ پرسکون ہو جاتا اور پھر پہلے جیسا ہو جاتا 'الف یا ب' کی رسی پکڑے ہوئے۔

لیکن یہ بات وہ اچھی طرح جان گیا تھا کہ کوئی کچھ بھی کہے، وہ یہیں رہتا آیا ہے، یہیں رہتا ہے اور یہیں رہے گا۔ وہ اپنے اندر اس مٹی کی سوندھی خوشبو کو محسوس کرتا ہے جس پر اس کے قدم جمے ہوئے ہیں۔ اس مٹی کی خوشبو سے اس کی روح تازہ دم رہتی ہے، وہ ان محسوسات کے سہارے ہی ایک غیر معمولی حوصلہ پاتا ہے۔ یہاں کے باوا آدم کا نرالا ہونا اسے دکھی ضرور کرتا ہے مگر جس طرح ڈوبتے ابھرتے اس نے اتنے دن گزار دئے، بقیہ دن بھی گزار ہی لے گا۔

اسے لوگوں سے ملنے جلنے میں بھی کبھی بہت خوف سا محسوس ہوتا، اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ جو آدمی اس سے خوش خوش مل رہا ہے، اس کے اندر اس کے لئے کون سی زہر کی ہانڈی پک رہی ہے اور یہ ہانڈی کب پھوٹ جائے گی۔ بس ایک مشینی انداز سا ہوتا، وہ آدمی ہنستا تو یہ بھی ہنس دیتا، سنجیدہ ہوتا تو یہ بھی سنجیدگی اختیار کر لیتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جو آدمی تنہائی میں اس سے بہت ہی اپنائیت، محبوبیت اور جاں نثاری کے انداز میں ملتا، وہی آدمی محفل میں نہ صرف اس سے بے اعتنائی برتتا بلکہ بسا اوقات اس کا رویہ دشمنی کی سرحدوں کو چھوتا ہوا نظر آتا۔ یہ تضاد اسے اکثر سخت پریشانی میں ڈال دیتا اور اس پر ایسی مایوسی طاری ہوتی کہ ہر چیز پر سے اس کا اعتماد اٹھ جاتا، خود اپنے آپ پر سے بھی۔ اہم بات یہ تھی کہ یہ چیز ہمیشہ وقتی ہوتی.......... کچھ دنوں کے بعد اس کا بخار اتر جاتا اور وہ نارمل ہو جاتا۔ بار بار کے اتار چڑھاؤ سے اتنا ضرور ہوا کہ اس نے دوسروں پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کرنا چھوڑ دیا، یعنی اگر اسے کوئی دن کی روشنی میں سورج کو دکھانے کی کوشش کرتا تو بھی وہ یقین نہیں کرتا۔ اصل میں اس نے جان لیا تھا کہ تمام باتوں میں ہاں ہاں کرنا ہی پرسکون زندگی گزارنے کا سب سے محفوظ راستہ ہے۔ وہ جانتا تھا کہ کوئی اس کا دوست نہیں مگر سب کے ساتھ دشمنی کا رشتہ بھی نہیں رکھا جا سکتا تھا، اس لئے وہ کوشش یہی کرتا تھا کہ نہ کسی سے دوستی نہ کسی سے دشمنی۔ اس رویے سے دوستی کا پلڑا جھکتا تو نہیں تھا لیکن دشمنی کی آنچ ضرور کم ہو جاتی تھی۔ اس کے لئے یہی بہت تھا۔

شک و شبہات کے باریک اور نظر نہ آنے والے تاروں میں جکڑا ہوا اس کا وجود کسی طرح زندگی کی گاڑی کو ناہموار اور ہچکولوں سے بھری راہوں پر کھینچ رہا تھا، کبھی کبھی اسے یہ معجزہ ہی لگتا۔ وہ اس سے قطعی لاعلم تھا کہ رنگ برنگی شک و شبہ کی چادر بار بار اس پر کیوں آن گرتی ہے۔ اس میں یا تو کہیں نہ کہیں اس کا قصور تھا، یا اس کی آنکھوں میں دوسروں کے لئے یہی چیز تھی، یا پھر وہ بالکل بے قصور تھا اور لوگوں کی سمجھ سے بالاتر

تھا۔ بہرکیف کہیں نہ کہیں پر کچھ ضرور تھا جو اسے پیلی روشنی کے گھیرے میں لے آتا۔ لیکن یہ گتھی اس سے نہ سلجھتی تھی۔ وہ کوئی بہت پڑھا لکھا فرد نہیں تھا جیسا کہ اس کے بعض ساتھی تھے، بہت باشعور بھی نہیں تھا، اسے بہت عقلمند بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ انہیں صفات کی بنا پر وہ ابھی تک زندہ بھی تھا۔ بہت پڑھا لکھا ہوتا، بہت باشعور ہوتا تو اپنی ان صفات کا استعمال بھی کرتا اور لوگوں کی نگاہوں میں آجاتا، آ کیا جاتا چڑھ جاتا، پھر شاید زندگی اتنی آسان نہ ہوتی ابھی تو یہ ہے کہ جو کچھ ہے وہ اس کے اندر ہے ساری سوچ، سارے کچے پکے منصوبے، ساری خوش فہمیاں، ساری غلط فہمیاں ...... وہ اندر ہی اندر ان سے لطف اندوز ہوتا تھا، اندر ہی اندر کڑھتا، اندر ہی اندر بھڑکتا، اندر ہی اندر خوش ہوتا۔ سر جھکا کے سڑکوں پر چلتا تو چلتا ہی چلا جاتا، کہیں کوئی رکاوٹ نہیں۔ ویسے اپنی فطرت کے مطابق ہر لمحہ، قدم قدم اسے خدشہ ہوتا کہ کہیں سے کوئی لمبا ہاتھ بڑھے گا اور اس کی گردن پکڑ لے گا۔ کہیں سے کوئی کرین نما چیز آئے گی اور اس کو ہوا میں اچھال دے گی، کہیں سے کوئی دیوار اٹھ کھڑی ہوگی اور اس کے سارے راستوں کو مسدود کر دے گی، مگر یہ سب کچھ نہیں ہوتا تھا اور وہ کسی طرح ڈرتا ڈرتا اپنی منزل تک پہنچ ہی جاتا اور پھر وہ سہما سہما سا اپنے گھر واپس ہو جاتا۔ کبھی کبھار کچھ چھوٹے بڑے ہاتھ اس کی گردن تک بڑھے ضرور، لیکن اس کی گردن ان کی گرفت سے محفوظ رہی، کبھی کبھی اس کے اطراف دیواریں بھی کھڑی ہوئیں، مگر وہ اس کا راستہ نہیں روک سکیں، وہ انہیں پھاند کر آگے نکل گیا، ان باتوں کے باوجود اس کے اعتماد کی وہ لو نہیں ڈگمگائی تھی جس کی آنچ سے اس کے سارے مفروضے بجھ جاتے اور وہ خالی خالی سا، خیالات کے بوجھ کے بغیر چلتا رہتا۔ اصل میں وہ روزانہ انہیں مفروضوں کے سہارے اٹھتا، انہیں کے سہارے اپنے بستر پر جاتا۔ اس معمول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

سر جھکا کے چلتے رہنا، ایک بندھی ٹکی منزل پر پہنچ جانا، وہاں سے واپس اپنے

ٹھکانے پر آجانا......اس سے کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ اس کی زندگی خوش وخرم بھی ہے۔ کبھی کبھی حالات ایسے پیدا ہو جاتے کہ اس کے مفروضوں کو نئی زندگی اور نئی جست مل جاتی اور وہ اسے پرانی ڈگر پر چلنے کو مجبور کر دیتے۔

صبح کی کرن پھوٹتی تو وہ اپنے آپ کو دن بھر کے سفر کے لئے تیار کرتا۔ سفر کے کوئی اور معنی نہیں بلکہ صبح سے دوپہر، دوپہر سے شام اور شام سے رات کرنے کا عمل۔

اس کے نپے تلے قدم اٹھ رہے تھے کہ اچانک اس کی آنکھیں چندھیا گئیں، اس کی پلکیں بے اختیار بند ہو گئیں، اس کی آنکھوں کو اس کے ہاتھوں نے فوراً ڈھانپ دیا۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے، ہوش میں آیا تو اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ روشنی کا ایک تیز جھماکا تھا جس نے ایک لمحے کے لئے اسے جکڑ دیا اور اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بیحد سیاہ اندھیرا چھا گیا۔ کچھ دیر کے بعد تاریکی چھٹی، اس کے ہوش وحواس واپس آئے، وہ سوچنے لگا کہ آخر یہ تھا کیا—؟ ابھی اس کی سوچ کے عمل نے پہلی ہی سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ پھر وہی واقعہ رونما ہو گیا۔ اس کی آنکھیں تیز وتند روشنی کے جھماکے سے تقریباً بند ہو گئیں۔ لیکن بند ہونے سے پہلے اس نے یہ ضرور دیکھ لیا کہ پڑوس کے تین منزلہ مکان کی سب سے اونچی کھڑکی پر کھڑا کوئی لڑکا دھوپ میں آئینہ دکھا رہا ہے۔ پہلے تو اسے بہت غصہ آیا کہ اس نے راہ چلتے خواہ مخواہ تنگ کیا، پھر اسے خیال آیا کہ یہ اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے۔ آئینہ اس کے ہاتھ میں ہوگا اور دھوپ کی تیز شعاعیں اس سے ٹکرا گئی ہوں گی۔ یہ سوچ کر وہ کچھ مطمئن سا آگے بڑھا، اسے فوراً محسوس ہو گیا کہ آئینہ اور دھوپ کے اس کھیل کا شکار وہی ہے۔ ایک چمکدار ہالہ اس کے وجود کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا ہالہ اس کے ساتھ ہی حرکت کر رہا تھا۔ اس نے رک کر کھڑکی کی طرف گھورا۔

ایک لڑکا آئینے کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں لئے اسے دھوپ کی شعاعوں کے زاویے میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کوشش سے جو تیز وتند ہالہ سا بن رہا تھا، اس کا مرکز وہی تھا...... صرف وہی......

لمحہ بھر میں بہت سی باتیں اس کے دماغ میں کوند گئیں۔ ابھی تک 'ہاں' اور 'نہیں' کی رن بھومی میں کسی طرح 'نہیں' کا ساتھ دے کر اس کا پلڑا بھاری کرنے میں کامیاب ہوتا رہا تھا، مگر اس کی ساری کامیابی ایک ہی جست میں ڈھیر ہوگئی اور 'ہاں' کا پلڑا اچانک بھاری ہوگیا۔

اس نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی کہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو اتنے دنوں دھوکا دیتا رہا۔ اصل سچ تو 'ہاں' میں مضمر تھا اور وہ 'نا' کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو فریب دیتا رہا۔ یہ پدی سا چھوکرا بھی انہیں لوگوں میں شامل ہے جو شک وشبہ کے ڈنڈے سے دھکیل دھکیل کر 'ہاں' کے جہنم میں اسے بھیجنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور وہ بہت ہی تگ ودو کے بعد کسی طرح 'نا' کی کمزور ڈور کو تھام کر اس جہنم سے نکل آتا ہے۔ اس چھوکرے کا یہ عمل کوئی علیحدہ ذاتی فعل نہیں بلکہ یہ ایک مربوط سازش کا چھوٹا سا حصہ ہے جس سے وہ ابھی تک انکار کرتا آیا ہے۔

سوچتے سوچتے اس کا دماغ بالکل گھوم گیا اور اس راستے پر بہت تیزی سے دوڑنے لگا جس سے وہ مانوس تو تھا، لیکن اس کے قدم اس سے آشنا نہیں تھے۔

اس نے سوچا...... اس فتنے کو شروع ہی میں نہیں دبایا گیا تو اس کی زندگی اجیرن بھی ہوسکتی ہے۔ ابھی یہ آئینہ چمکار رہا ہے کل کو لوہے کی دیوار کھڑی کر دے گا، پرسوں......

اس نے فیصلہ کیا کہ شام کو واپسی پر وہ لوگوں سے صلاح مشورہ کرے گا۔ اس فیصلے سے وقتی طور پر اسے سکون سا ملا، اندر جو ایک جوار بھاٹا اٹھا تھا، وہ بھی بیٹھ گیا۔ وہ آگے بڑھ کر آئینہ کی زد سے باہر نکل گیا۔

شام کو واپس آیا تو صبح کے سوچ کی تیز لہریں سرد ہو چکی تھیں، ارادے کی مضبوطی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ تھکاوٹ غالب آ چکی تھی۔

اس نے سوچا...... بات بڑھانے سے کیا فائدہ، ہوسکتا ہے بچے کا عمل اتفاقی ہو، ممکن ہے اس سے یہ حرکت کھیل کھیل میں سرزد ہوگئی ہو، ہوسکتا ہے وہ اس عمل کا مرکز نہ ہو۔ آخر یہ کیسے ثابت ہو کہ یہ حرکت اسی کے لئے کی گئی ہے، لیکن پھر یہ سوال تو رہ ہی جاتا ہے کہ آخر کیوں......؟

پریشان کرنے کے اور بھی طریقے ہیں، کچھ جانے بوجھے ہیں اور بالا واسطہ اور بلاواسطہ اس پر آزمائے بھی گئے ہیں۔ کچھ طریقوں کے بارے میں اس نے سن رکھا ہے، ایک آدھ بار اس کے منہ سے صدائے احتجاج بھی نکلی ہے، لیکن نتیجہ......؟

الٹا اسے ہی تمسخر کا نشانہ بننا پڑا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ آخر صرف اسے ہی پریشان کرنے کی وجہ......؟ اس قسم کی حرکت تو اس وقت کی جاتی ہے کہ مدمقابل مضبوط ہو، اس کی کیا حیثیت ہے کہ اسے تنگ کرنے کے لئے الٹا ہاتھ گھما کر ناک چھونے کی کوشش کی جائے۔ اسے تو سامنے کھڑا کر کے بھی نمٹا جا سکتا ہے، برسرعام زیر اور ذلیل کیا جا سکتا ہے، اسے برسرعام مار ڈالا بھی جائے تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ یہ ساری باتیں واقع نہیں ہوئیں بلکہ اس نے اپنے تصور میں یہ ساری باتیں سجائیں اور اس نتیجے پر پہنچا کہ شکایت کرنے سے اس کی موجودہ حیثیت بھی کہیں کمزور نہ ہو جائے......!

اس کے خودساختہ سوال اور سوچے سمجھے جواب نے اسے سمجھا دیا کہ فی الحال وہ اس معاملے کو بھول ہی جائے۔

دورانِ شب خوابی اس کی آنکھوں میں خاصی جلن محسوس ہوئی۔ اس نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے، آرام تو ہوا پر وقتی طور پر۔ وہ بار بار چھینٹے مارتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ فوری طور پر اسے ایک نئی بات سوجھی کہ صبح جو آئینہ کے

ذریعہ دھوپ کی تیز شعاعیں اس کی آنکھوں سے ٹکرائی تھیں شاید یہ اسی کا نتیجہ ہو۔ اسے خیال آیا کہ اس واقعہ کی شکایت تو درج کر ہی دینا چاہئے تھی، کم سے کم آئندہ کے لئے تو احتیاط ہو جاتی۔

آدھی رات تکلیف برداشت کرنے اور آدھی اسے دور کرنے کی تگ و دو میں گزر گئی۔

صبح آنکھوں کی جلن کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔ البتہ ایک احساس سا رہ گیا تھا کہ کوئی چھوٹا موٹا سا طوفان یہاں سے گزرا ہے۔ طوفان کا شاید کوئی اثر باقی رہ گیا تھا۔ بیوی نے عجیب نگاہوں سے گھورا۔

''سوئے تو بہت گہری نیند تھے، پھر یہ آنکھوں میں......؟''

جواب میں اس کی زبان پر پچھلی صبح کا واقعہ آتے آتے رہ گیا۔ بیوی شروع ہی سے اسے وہمی سمجھتی تھی۔ سن کر اور کچھ تو نہ ہوتا بس اس کے یقین میں ایک اضافہ ہو جاتا۔ اس نے بہتر یہی سمجھا کہ ہوں ہاں میں بات ٹال دے اور اپنے کام پر جلدی سے نکل جائے۔

نہ...... یہ اتفاق ہرگز نہیں تھا۔ اتفاق روز روز نہیں ہوتے، ابھی تک وہ اس بھرم میں تھا کہ اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ بات بھلانے کی کوشش بھی کی تھی اور اپنے آپ کو کسی حد تک مطمئن بھی کر لیا تھا، آنکھوں کی تکلیف کو بھی نظر انداز کر دیا تھا، لیکن......

آج پھر وہی کچھ ہوا جو کل ہوا تھا۔ ٹھیک اسی مقام اور وقت پر آئینہ اور دھوپ کی چمکدار آمیزش نے اسے پھر اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے چاروں طرف روشنی کا ایک ہالہ سا بن گیا۔ روشنی کی شدت سے اس کی آنکھیں تقریباً بند ہو گئیں، اس کے اٹھتے ہوئے قدموں میں اچانک ایک بریک سا لگا اور وہ، گویا ایک دھچکے کے ساتھ رک گیا۔ روشنی ایک جگہ مرکوز رہتی تب بھی شک کی ایک موہوم سی گنجائش رہ جاتی، لیکن روشنی کا ہالہ تو اس کے چاروں طرف ناچ رہا تھا۔ وہ اس کے حصار میں تھا۔ ناچنے کا انداز یہ تھا کہ جیسے اسے دھمکی دی جا رہی ہو، آگے بڑھ کر تو دیکھو...... وہ دو قدم آگے بڑھتا تو چار قدم پیچھے ہٹ

جا تا، ایک عجیب صورت حال در پیش تھی۔ وہ پورے طور پر اوپر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ روشنی کا فوارہ وہیں سے تو پھوٹ رہا تھا۔ کافی دیر ہوگئی اور صورت حال جوں کی توں بنی رہی تو اس نے ایک فیصلہ کیا۔ ایسا فیصلہ جس کے سوا اور کوئی فیصلہ ممکن ہی نہیں تھا، وہ کسی طرح سب کچھ جھیلتے ہوئے آگے بڑھ جائے......

دن بھر وہ اپنے کام میں لگا ضرور رہا لیکن اس کا جی بالکل نہیں لگا۔ رہ رہ کر اسے محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے بھرے بازار میں اسے سینکڑوں جوتے لگائے ہوں...... ظاہر ہے کہ یہ نہیں ہوا تھا لیکن اس آئینے میں ضرور کوئی ایسی طاقت تھی کہ اسے طرح طرح کی رسوائیوں اور ذلتوں کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ سوچتے سوچتے پریشان ہو جاتا کہ آخر وہ اس ذلت کا نشانہ کیوں بنا — ؟ وہ اس شخص کی ذہانت پر عش عش کرتا جس کی حکمت عملی سے شکار کو انگلی بھی نہ لگی اور اس کی گردن بھی کٹ گئی۔ اس ایجاد نے اس محاورے کو بھی پھیکا کر دیا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

چنانچہ اپنی کٹی ہوئی گردن کو بڑی مشکلوں اور جتن سے اپنے جسم پر جمائے اس نے کسی طرح صبح سے دوپہر، دوپہر سے سہ پہر اور سہ پہر سے شام کر لی اور ایک شکست خوردہ کی طرح گھر میں داخل ہوا۔

بیوی نے اس کا یوں منہ لٹکا دیکھا تو اس نے بھی اپنا منہ بچکا لیا۔

''یہ کیا روز روز مری ہوئی حالت میں واپس آتے ہو، ایک تم ہی تو کام نہیں کرتے۔''

''تم نہیں سمجھ سکتیں، میں کس مصیبت میں گرفتار ہوں......''

اس نے ایک گمبھیر سا جواب دے کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کوشش کا الٹا اثر ہوا۔ اس نے اس کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور فکر مندی سے بولی۔

''ماتھا تو ٹھیک ہے، کہیں زیادہ تھک تو نہیں گئے......؟''

عورت کی معصومیت پر اس کا دل بھر آیا۔ ہمدردی کے بول نے اس کے اندر ٹھنڈے پانی

کی پھواریں سی چھوڑ دیں۔

اس نے اپنے آپ پر قابو پا کے جواب دیا۔

''طبیعت وبیعت کو کچھ نہیں، مصیبت کی وجہ کچھ اور ہے۔''

میں نہیں جان سکتی کیا— ؟''

اس نے عجیب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ معصومیت، اپنائیت، محبت، طاقت، ہمت، کچھ کر گزرنے کا جذبہ، بہت کچھ کر گزرنے کا عزم......

اس نے اس ایک لمحے میں سوچ لیا کہ اس عورت کو اپنی مشکلات میں شریک کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ مددگار ثابت نہ بھی ہو سکے پھر بھی اس کا ساتھ تو دے گی ہی...... جذباتی اور اخلاقی تعاون......

اس نے مختصر الفاظ میں سارا واقعہ کہہ سنایا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا، اس کی بیوی کے چہرے کا تناؤ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ختم ہوتے ہوتے اس کا سارا تناؤ ختم ہو گیا۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ بولی۔

''میں تو سمجھ رہی تھی، کوئی خاص بات ہو گی، لیکن یہ تو ایک وہم ہے...... صرف وہم......''

''وہم......؟ تم اسے وہم کہہ رہی ہو......؟ اتنے بڑے واقعے کو وہم......؟ اگر یہ چیز کل تک سمٹ جاتی تو شاید میں بھی اسے وہم ہی سمجھتا، لیکن یہ تو صاف سوچی سمجھی سازش ہے، اس پر فوراً روک نہ لگائی گئی تو یہ چیز کل بھی ہو گی، پرسوں بھی......''

وہ جوش میں آ گیا، جو اس جیسے شانت آدمی کے لئے غیر معمولی چیز تھی۔ بیوی نے حیرت سے اسے دیکھا اور آہستہ سے بولی:

''چلو مان لیا یہ حرکت جانی بوجھی ہے، پھر اس کا حل کیا ہے......؟''

''حل......؟ حل......؟''

وہ شش و پنج میں پڑ گیا، یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ لیکن اب اس نے فوراً سوچ لیا۔

''احتجاج کروں گا، لوگوں کے پاس جاؤں گا، ان سے انصاف طلب کروں گا......''

''تم کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہے ہو۔ یہ اتنا بڑا واقعہ نہیں ہے کہ اس کے لئے تم اتنا ہنگامہ کرو، میری مانو تو اسے بھول ہی جاؤ......؟''

بیوی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، وہ بھڑک گیا۔

''یعنی وہ روز مجھے تنگ کرتے رہیں اور میں چپ چاپ برداشت کرتا رہوں۔ اس دن کے انتظار میں کہ وہ میری گردن اتار لیں اور میری لاش احتجاج کے طور پر سڑک پر رکھ دی جائے......''

''کم سے کم ایک آدھ دن تو اور دیکھ لو......''

بیوی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھی، لیکن وہ تھا کہ اپنے ارادے پہ اٹل تھا۔

''اس ایک آدھ دن کے چکر میں وہ پورے دو دن مجھے تنگ کرتے رہے۔ اب میں انہیں کوئی موقع نہیں دے سکتا......''

اس نے گویا اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

مشورہ ہی کی سطح پر اتفاق رائے کا فقدان ہو گیا۔

کئی طرح کی رائیں......؟

کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ چیز محض اتفاق بھی ہو سکتی ہے، کوئی ضروری نہیں کہ لگاتار دو دن یہ چیز ہو گئی تو آئندہ بھی ہوتی رہے۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ حرکت جان بوجھ کر بھی کی گئی ہے تو بھی خاموشی ہی کو راہ دینی چاہئے، احتجاج کرنے یا ہنگامہ کرنے سے فائدہ کچھ نہیں ہوگا، الٹے دوسری مصیبت بھی گلے پڑ سکتی ہے۔ اس پر کچھ لوگ بھڑک اٹھے کہ اس طرح تو شرپسندوں کے حوصلے اور بڑھ جائیں گے۔ آج ایک چھوٹی سی حرکت کی ہے، کل بڑی کر سکتے ہیں، پرسوں اس سے بھی بڑی......

ایک طبقے کی رائے تھی کہ راستہ ہی بدل دینا چاہئے، اس طرح سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔

کچھ لوگوں نے بہت ہی تیکھے انداز میں پوچھا کہ کتنے راستے بدلے جائیں گے اور اس کی گارنٹی کیا ہوگی کہ دوسرے اور تیسرے راستے پر اس قسم کی حرکت نہیں ہوگی۔

ایک گروہ ایسا بھی آیا جو تعداد میں تو کم تھا لیکن اپنی بات زور سے بلکہ چیخ کر کہتا تھا جیسے سارے سننے والے بہرے ہوں۔ اس طرح وہ بڑے گروہوں پر حاوی ہو جاتا تھا، اس طرح اس کی چیخ فیصلہ کن ہو جاتی تھی۔

وہ گروہ سب کی باتیں سنتا رہا اور اندر اندر پیچ و تاب کھاتا رہا۔

سب اپنی اپنی ڈفلی بجا چکے تو وہ بھی چیخ پڑا۔

''کیا بکواس کر رہے ہیں آپ لوگ — ؟ آپ لوگ شکست خوردہ ہیں، آپ کو دن کی روشنی میں بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا، آپ چاہتے کہ ہم مار بھی کھاتے رہیں اور ہنستے بھی رہیں — ہم اینٹ کا بدلہ پتھر سے لیں گے۔ انہوں نے ہمیں ایک آئینہ دکھایا ہے، ہم انہیں سو آئینے دکھائیں گے......''

سب کو سانپ سونگھ گیا۔ انہیں ایسا لگا کہ آئینہ صرف ایک کو نہیں سب کو دکھایا گیا۔ لیکن انہوں نے فوری طور پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ انہوں نے منہ توڑ جواب دیا تو اس کا فائدہ انہیں ہی پہنچے اور شاید اسی لئے اس طرح کی شرارت کی جاتی ہے۔ انہوں نے تحمل کے ساتھ جواب دیا۔

''بیٹے ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں، مگر آپ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر ہم کیا فاتح ہو جائیں گے — ؟ اس وقت صورت حال کچھ یوں ہے کہ ہمیں بہت سی باتیں نظر انداز کرنی ہوں گی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھ گئے تو بڑے مقاصد ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے......''

لیکن اس گروہ پر ان تحمل آمیز باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ تیز و بلند آواز میں یہی دہراتا رہا کہ اس واقعے پر احتجاج ضرور ہونا چاہئے، چپ چاپ بیٹھ جانے سے ہماری کمزوری ثابت ہوگی اور دوسروں کے حوصلے بلند ہوں گے، وغیرہ وغیرہ۔
ان کی آواز کے سامنے دوسری تمام آوازیں بالکل دب گئیں۔ جو سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے، ان کا تو ذکر ہی کیا، جو دھیمے سروں میں کچھ کہہ رہے تھے، ان کی آوازیں تو شوروغل میں بالکل گم ہوگئیں اور کئی گھنٹوں کی مغزماری کے بعد ہوا وہی جو بلند آواز والے چاہتے تھے۔ غنیمت تھا کہ انہوں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے پر اصرار نہیں کیا۔ طے ہوا کہ چند خاص لوگوں پر مشتمل ایک جماعت کی تشکیل ہو اور وہ وہاں ان کے درمیان جا کر احتجاج درج کرائے اور آگے کی کارروائی پر غور کرے۔

بہت دیر تک تو وہ سمجھ ہی نہیں پائے کہ وفد آخر کس سلسلے میں آیا ہے، بات کسی طرح انہیں سمجھائی گئی اور وفد کے آنے کا مقصد واضح کیا گیا تو وہ اچنبھے میں پڑ گئے۔ وہ کسی طرح ماننے کو تیار ہی نہیں تھے کہ یہ بھی کوئی واقعہ ہے جس کے لئے احتجاج کی آواز بھی بلند کی جاسکتی ہے۔ ان کے چہرے پر تمسخر کی لہریں پھیل گئیں۔ انہوں نے دوسری باتیں شروع کر دیں مثلاً ملک میں بیروزگاری بہت بڑھتی جا رہی ہے۔ حکومت وعدے کرتی ہے کام نہیں کرتی، بڑھتی ہوئی آبادی ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر سب کو مل بیٹھ کے سوچنا چاہئے۔ الزام تراشی اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے سے کام نہیں چلتا، ہر شخص انفرادی طور پر اپنی ذمہ داریاں سمجھ لے تو ہمارا ملک ۲۰۲۰ میں نہیں بلکہ آناً فاناً دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں آجائے گا، وغیرہ وغیرہ۔

وہ بہت بے دلی سے ان کی باتیں سنتے رہے، وہ جس مقصد سے آئے تھے، وہ فوت ہوا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک شخص نے اکتا کر ان کی بات کاٹی۔

''بھائی صاحب، آپ کا کہنا سر آنکھوں پر، ان باتوں کی سچائی سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن ابھی ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے اس پر ہم فوراً توجہ دیں تو زیادہ بہتر ہے......''

''یہی تو ہم نہیں سمجھ رہے ہیں کہ ایسا کون سا گمبھیر مسئلہ ہے جس کے لئے......''

جواب ملا۔

''ہمارے سماج کے ایک فرد کو زبردست اخلاقی اور ذہنی چوٹ لگی ہے جس کا درد ہم سب کو محسوس ہورہا ہے، اب آپ ہی بتلایئے، ایک پورا سماج درد میں مبتلا ہو تو اسے دوسری بڑی باتیں کیسے سوجھ سکتی ہیں......''

''تو اس سلسلے میں فوری طور پر کیا کرنا چاہیے......؟''

ایک سوال اچھلا۔

جواب تیار تھا۔

''فوری طور پر یہ ہونا چاہیے کہ ملزم سے باز پرس ہونی چاہیے......''

''مان لیجیے، اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تب......!''

سوال پہ سوال۔

''لیکن دو دن لگاتار ایسی حرکت بغیر جانے بوجھے تو نہیں کی جاسکتی......؟''

دلیل......

''چلئے، مان لیتے ہیں اس کی حرکت جانی بوجھی تھی، پھر اس کی سزا کیا ہونی چاہیے......؟''

پھر سوال —

''یہی تو سوچنا ہے، ہم کو اور آپ کو مل کر کہ کیا کرنا چاہیے......''

بات کسی حد تک راستے پر آرہی تھی۔

''دیکھئے یہاں بال کی کھال نکالنے سے کیا حاصل ہوگا۔ اور یہ تو کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں ہے کہ اس پر اتنا وقت اور اتنی قوت صرف کی جائے، سب سے اچھا راستہ یہ ہے کہ اسے

بھول ہی جایئے......''

نیک مشورہ۔

''مگر بھائی، نظرانداز کر دینے سے معمولی پھنسی بھی تو زخم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ آج یہ واقعہ چھوٹا ہے، کل کو اس سے بڑا واقعہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ پرسوں......
ان باتوں کی آخر حد کیا ہوگی......؟''

اندیشہ۔

''آگے کیا ہوگا، کل کیا ہو جائے گا، اس کی گارنٹی تو کوئی نہیں دے سکتا۔ ہم تو جب بولیں گے تو آج کے بارے میں، آپ یہ بتایئے کہ آپ اس سلسلے میں کیا چاہتے ہیں......؟''

دوستانہ انداز۔

''ہمارے خیال میں یہ واقعہ جانا بوجھا ہے۔ اس کے ملزم کو سزا ملنی چاہیے......''

فیصلہ کن بات۔

''سزا بھی آپ ہی طے کر دیجئے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے پھانسی تو نہیں دی جا سکتی، یعنی پھانسی کے علاوہ جو سزا آپ تجویز کر دیں......''

دوسرے کے آنگن میں پوری گیند۔

اس مسئلے پر بھی اتفاق رائے نہیں تھا۔

کچھ لوگ اس بات پر بہت خوش تھے کہ ہم نے بالآخر انہیں جھکا ہی دیا، انہوں نے گھما پھرا کر اپنا جرم تو تسلیم کر ہی لیا، اب مزید آگے جانے سے کوئی فائدہ نہیں، اس سے ہماری شکست بھی ہو سکتی ہے۔

لیکن دوسرے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ——

''معاملہ تو اب شروع ہوا ہے، ختم ہونے کا کیا سوال ہے۔ ایک سنہری موقع ہمارے ہاتھ

آیا ہے کہ ہم کوئی سزا تجویز کریں اور کوشش کریں کہ اس پر عمل درآمد بھی ہو جائے اور وہ اس کے لئے تیار بھی ہیں ـــــ "

کچھ ایسے بھی تھے جو یہ کہتے تھے کہ اس معاملے کو شروع ہی نہیں کرنا چاہئے تھا۔ دو چار روز اور دیکھ لیتے، کیا پتہ، یہ واقعہ کوئی واقعہ ہی نہ ہو۔

اس پر تمام لوگوں نے انہیں گھورا۔ گھورنے پر وہ یوں خاموش ہوئے جیسے انہوں نے کبھی اپنی زبان کھولی ہی نہیں ہو، بلکہ کچھ تو ہوا کے رخ کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگے۔

کل ملا کر یہ طے ہوا کہ جب انہوں نے خود ہی سزا کی بات کی ہے تو اس سے منہ موڑنا مناسب نہیں ہوگا، اس لئے سزا تو تجویز کر ہی دینا چاہئے۔

لیکن بات سننے اور دیکھنے میں جتنی آسان لگ رہی تھی اتنی آسان تھی نہیں۔ سزا تجویز کرنے کے سلسلے میں ہر شخص منصف بن بیٹھا، ہر ایک کی زبان سے الگ الگ سزائیں نکلنے لگیں، جس کے نتیجے میں بہت دیر تک کوئی بات نہیں بنی تو اتفاق رائے سے ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی، جسے ایک مقررہ وقت کے اندر اپنی تجویز پیش کرنے کو کہا گیا۔ اس درمیان آئینے کی تیز چمک کا معاملہ پھر سامنے آ گیا۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس دفعہ چمک نے اس کے چاروں طرف گھیرا نہیں ڈالا، صرف اس کی آنکھوں کو چمکا کر غائب ہو گئی، ایک آدھ بار قدموں پر بھی روشنی پڑی، لیکن اس کے قدم نہیں رکے۔ اس نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی، دراصل اس کو اطمینان تھا کہ اس کا احتجاج تو درج ہو ہی چکا ہے اس لئے اس قسم کی حرکت کرنے والے کو سزا ضرور ملے گی۔

وہ چلتا رہا۔ اس کے ساتھ کئی ایسے واقعے بھی ہوئے جن کے سبب بات بڑھ سکتی تھی، وہ آپے سے باہر ہو سکتا تھا، اس کی اوپری کھوپڑی جس میں خون کے علاوہ کچھ فاسد مادے بھی تھے، کھول سکتی تھی، اور بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا، وہ چپ چاپ بے نیاز سا سیدھی راہ پر چلتا رہا، اسے محسوس ہوا کہ کہیں دور دور سے کچھ آوازے بھی

کسے جا رہے تھے، منہ سے ایسی کریہہ آواز نکالی جا رہی تھی جسے سن کر اچھے بھلے آدمی کا منہ بن جائے، راستے میں کوڑے کی تھیلیاں پھینکی گئیں کہ اگر کمال ہوشیاری سے وہ بچ نہیں نکلتا تو غلیظ تو ہو ہی جاتا، گندے پانی کی بالٹیاں یوں انڈیلی گئیں کہ بہت بچتے بچاتے اس کے چھینٹے اس کے کپڑوں پر ضرور پڑ گئے، لیکن ان تمام باتوں سے بے پروا اس کے دل میں تشفی کا پیڑ اپنی جڑیں مضبوط کرتا رہا کہ اس نے مناسب جگہ پر اپنی شکایت پہنچا دی ہے، اس کی شکایت دور کرنے کے لئے کمیٹی کی تشکیل بھی ہوگئی اور اب اس کمیٹی کو صرف سزا تجویز کرنی ہے۔

کمیٹی نے اپنی کئی نشستیں منعقد کیں، کچھ ہنگامی نشستیں بھی ہوئیں لیکن اتفاق رائے نہیں ہو سکا، اتفاق رائے ہوتے ہوتے رہ گیا۔ یوں محسوس ہوتا کہ کوئی چکنی مچھلی ہاتھ آتے آتے پھسل گئی۔ جمہوری طرز پر بھی عمل پیرا ہونے کا ارادہ ہوا کہ اگر کسی ایک بات پر زیادہ لوگ متفق ہوں تو اسے بھی نقارۂ خدا سمجھ کر تسلیم کر لینا چاہئے۔ مگر یہ بات اسی وقت ممکن تھی جب دو یا زیادہ سے زیادہ تین خیالات آمنے سامنے ہوں، وہاں تو کئی دھرے تھے اس لئے جمہوری طرز پر عمل پیرا ہونے سے اور انتشار پیدا ہونے کا خطرہ تھا۔

تھک ہار کے فیصلہ کیا گیا کہ یہ معاملہ اسی پر چھوڑ دیا جائے، آخر اسی کی شکایت پر تو سارا معاملہ شروع ہوا تھا۔ وہ شروع میں خوش تو ہوا، اصل میں اسے پتہ نہیں تھا کہ وہ ایک ایسے جال میں پھنسنے جا رہا ہے جہاں سے نکلنے کے سارے راستے معدوم ہیں۔ اس نے پہلے پہل تو بڑے اعتماد کے ساتھ مروجہ قانون اور قانون کی تسلیم شدہ کتابوں کا حوالہ دیا اور صاف صاف کہا کہ زیادہ مغز پچی کی ضرورت ہی نہیں، جو قانون کہتا ہے بس اس پر عمل کیا جائے۔ اس میں مشکل یہ آ پڑی کہ قانون اور اس کی تسلیم شدہ کتابوں میں اس نوعیت کے جرم کا کہیں ذکر ہی نہیں ملا، پھر کون سا جرم اور کہاں کی سزا......

کچھ لوگوں نے چپکے سے رائے دی کہ وہ اپنی شکایت واپس ہی لے لے، سارا مسئلہ اپنے

آپ ختم ہو جائے گا لیکن رائے دینا جتنا آسان تھا، اس پر عمل درآمد اتنا ہی مشکل بلکہ ناممکن...... کچھ قدم ایسے ہوتے ہیں جو آگے بڑھتے ہوئے پچھلے قدموں کو مٹاتے جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہش کے باوجود الٹے قدموں واپس آنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کا حل صرف یہ ہوتا ہے کہ آگے ہی کا کوئی راستہ تلاش کیا جائے۔ یعنی حل نکلنے کے بجائے مسئلہ الجھتا ہی جاتا ہے۔ شکایت واپس لینے کا اب کوئی سوال ہی نہیں تھا، اس نے جب شکایت درج کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس وقت یہ چیز اس کی ذاتی ملکیت تھی، اب یہ عوامی چیز بن چکی تھی۔ لہٰذا اب واپسی کا سفر بہت مشکل ہو گیا تھا۔ وہ خود تو ایک معمولی، حاشیائی آدمی تھا اور محض اتفاق نے اسے مرکز کے قریب پہنچا دیا تھا۔ اس رائے پر وہ کوئی ردعمل ظاہر نہیں کر سکا اور جن لوگوں کے کانوں میں یہ بات پہنچی، انہوں نے رائے دینے والوں کو یوں گھورا کہ وہ جلدی سے بھیڑ میں منہ چھپا کے غائب ہو گئے۔

تھک ہار کر فیصلہ کیا گیا کہ اس بڑے آدمی سے رجوع کیا جائے جو یوں صاف فیصلے تو نہیں کرتا لیکن اس کا فیصلہ ماننے پر سب مجبور ضرور ہوتے ہیں۔

O

وہ بھی ایک عجیب وغریب ہستی تھا۔

وہ صرف اس اعتبار سے بڑا نہیں تھا کہ اس کے پاس بہت پیسہ تھا اور ہاتھوں میں اقتدار کا جادوئی ڈنڈا، بلکہ اس لئے بھی کہ پسند نہیں کرنے کے باوجود لوگ اس کی باتوں پر سر تسلیم خم کرتے تھے۔ مجبور کہنا بالکل صحیح نہیں کہ وہ اپنی باتوں کو منوانے کے لئے نہ تو جادوئی ڈنڈا گھماتا تھا نہ کسی کو اس کے لئے مجبور کرتا تھا اور یہ اسے بھی اچھی طرح پتہ تھا کہ زیادہ تر

لوگ دل سے اس کو پسند نہیں کرتے تھے، مگر اس کے سامنے سر جھکاتے تھے۔ عجیب وغریب قسم کی اس مقبولیت نے اسے بے تاج کی سرداری عطا کر دی تھی، جس سے وہ خوب فائدہ اٹھاتا تھا۔

پہلے پہل تو اس نے اس پر کوئی دھیان ہی نہیں دیا، یوں بن گیا جیسے کچھ سنا ہی نہیں، لیکن جب ایک ہی بات بار بار اس کے سامنے دہرائی جانے لگی تو اس نے بس سن لیا، کچھ بولا نہیں۔ ان لوگوں کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ سنے یا نہ سنے مگر وہ اپنی بات کہتے رہیں۔ چنانچہ لوگ کہتے رہے، وہ سنتا رہا۔ مگر شاید اسے جلد ہی محسوس ہو گیا کہ بات اتنی معمولی نہیں جتنی وہ سمجھ رہا تھا، اگر کبھی معمولی تھی بھی تو اب معمولی نہیں رہی۔ اس نے کچھ لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہے اس لئے معمولی ہوتے ہوئے بھی یہ بات اب اہم بن گئی ہے۔

غور سے سننے پر تو اسے پہلے یقین ہی نہیں آیا کہ اتنی معمولی بات کے لئے اس سے رابطہ قائم کیا گیا ہے۔ اس نے اس بات کے اصل کو سمجھنے کی کوشش کی، پھر بھی اس کا دل ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا کہ دھوپ میں محض آئینہ چمکانے سے بات یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ اب بات اس تک پہنچ ہی گئی تھی اور اس نے سن بھی لیا تھا تو اس سلسلے میں اسے کچھ تو کرنا ہی تھا۔

اس نے پوچھا۔

"کیا ضروری ہے کہ یہ حرکت شرارت کی غرض سے ہی انجام دی گئی ہو —؟ دھوپ کو تو بند کوٹھری یا بند مٹھی میں قید نہیں کیا جا سکتا نا۔ جب بھی کوئی آئینہ دھوپ کے Contact میں آئے گا تو ضرور چمکے گا۔ اس میں شرارت کا پہلو کہاں اور کیسے پیدا ہوتا ہے —؟

"ایسا ہے کہ چمک کا جو حصار تھا، وہ اسی شخص کے گرد تھا، جیسے جیسے یہ آگے قدم بڑھاتا، حصار کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا تھا۔"

حلیمی سے جواب دینے کی کوشش کی گئی۔

''جب وہ قدم بڑھا ہی رہا تھا تو بڑھاتے بڑھاتے اپنی منزل تک بھی پہنچ جاتا......؟''

جرح......

لیکن مقدمے کے ساتھ تو جرح کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اس لئے مدعالیہ اس سلسلے میں ضرور کچھ سوچ لیتا ہے۔

''وہ رکا نہیں، اپنی منزل تک پہنچ گیا۔ لیکن دوسرے دن پھر یہی واقعہ دہرایا گیا......''

''مگر پھر بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کا مقصد شرارت ہی تھا ـــــ ؟''

سوال سے جواب پیدا ہوتا ہے اور جواب سے سوال......

''ہم انصاف کے لئے آئے ہیں، ہماری آواز ضرور سنی جائے......''

موقف پر اٹل رہنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

''ضرور......لیکن مجرم کہاں ہے ـــــ ؟

سوال تاریک آسمان پر ایک روشن ستارے کی طرح چمکا، تھوڑی دیر تک چمکتا رہا، پھر دھیرے دھیرے نیچے......جیسے جیسے وہ اترتا جاتا تھا، تاریکی دور ہو رہی تھی، یہاں تک کہ روشن ستارہ زمین کے بالکل قریب آ پہنچا۔

مجرم کہاں تھا ـــــ ؟

اس پر تو کسی کا ابھی تک دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ جرم کے بارے میں اتنی باتیں ہوئیں، اس کے پیچھے طرح طرح کی سازشیں تلاش کر لی گئیں۔ سازش کے مقصد کو بھی ڈھونڈ نکالا گیا، لیکن مجرم......؟

خیریت اس میں تھی کہ مجرم کو جلد سے جلد ڈھونڈ نکالنے کا وعدہ کر لیا جائے۔ بڑا آدمی یونہی بڑا نہیں بن گیا تھا، اس کی نگاہیں بہت باریک بین تھیں۔ وہ بڑی بڑی چیزوں کو اکثر نظر انداز کر دیتا لیکن چھوٹی اور مہین چیزوں کو فوراً پکڑ لیتا تھا۔ معاملہ اس کے سامنے چلا گیا

تھا تو اب اس سے پیٹھ موڑنا بھی مشکل تھا۔ اس میں خطرہ خود بھی پھنس جانے کا تھا۔ وہ ایسی حالت میں اکثر یک طرفہ فیصلہ کر دیتا...... بالکل من مانا......
آخر وہ یونہی بڑا آدمی نہیں بن گیا تھا۔

''یہ بات تو سب سے پہلے سوچنے کی تھی کہ جب ہم ایک لڑائی کا آغاز کر رہے ہیں تو آخر ہمارا نشانہ کون ہے — ؟''
''کسی ایک شخص کی آواز نہیں تھی بلکہ ان سب لوگوں کی متفقہ رائے تھی جو نئی صورت حال کے پیش نظر یکجا ہونے پر مجبور ہوئے تھے۔ سوال متفقہ تھا تو جواب بھی کہیں انہیں لوگوں میں پوشیدہ تھا۔ اسے تلاش کرنا تھا، تلاش کے عمل میں وقفے وقفے سے جو خاموشی آئی، وہ دراصل سفر کے پڑاؤ تھے۔
کچھ خاموشی کے بعد جواب آیا۔
''وہاں پر تو بہت مکانات ہیں اور ہر مکان میں بے شمار کھڑکیاں ...... ظاہر ہے کہ انہیں کھڑکیوں میں سے کسی ایک میں مجرم ہوگا......''
''اس بات سے مجرم کی نشاندہی کہاں ہوتی ہے۔ اس سے تو اجتماعی جرم اور مشترکہ مجرم کا شبہ پیدا ہوتا ہے......''
''ان باتوں سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہماری لڑائی بس یہ ہے کہ کوئی مجرم ہے جس نے یہ شرارت کی ہے اور اسے قرار واقعی سزا ملنی چاہئے......''
''تو پھر اصل مجرم کو پکڑا کیسے جائے......''
''مسئلہ تو یہی ہے۔ ہم مجرم کو نہیں پکڑ سکے تو اپنا مقدمہ ہار جائیں گے......''
''انہیں مجرم کو پکڑنے کو نہیں کہا جا سکتا......؟''
''وہ ایسا کیوں کرنے لگے......؟ وہ تو یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ یہ کوئی جرم بھی ہے یا یہ کہ

کسی نے جان بوجھ کر شرارت کی ہے۔ ان کی باتوں سے تو لگتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم سب کا آپس کا کوئی معاملہ ہے......''

''یعنی......یعنی......ہم نے جان بوجھ کر اسے ایک مسئلہ بنایا ہے......''

''یہاں تک کہ آئینہ دکھانے سے ہم چڑتے کیوں ہیں۔ ہم میں اتنی ہمت ہی نہیں کہ آئینہ کے روبہ رو ہوسکیں......''

''بھئی، ہماری باتوں سے تو ایسا لگتا ہے کہ ہم نے بہت سی ایسی باتیں بھی ان کے منہ سے نکلوالیں جو کبھی ان کے منہ سے نکلیں بھی نہیں۔ ان باتوں سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، ہم دوسری باتوں میں الجھ جائیں گے اور ہمارا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس وقت ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم کسی طرح مجرم کو تلاش کریں اور اسے سزا دلانے کی کوشش کریں......''

اس قدرے طویل تقریر سے ان باتوں پر وقتی طور پر سرد پانی پھر گیا جو مختلف معلوم اور نامعلوم گوشوں سے سر اٹھارہی تھیں۔ مگر یہ سوال تو بہر حال جواب طلب رہ ہی گیا کہ مجرم کون، کہاں اور کس طرح — ؟

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم ہی میں کچھ لوگ اس بات کے لئے تیار ہوں کہ وہاں گھروں کی تلاشی لیں اور مجرم کو پکڑنے کی کوشش کریں — ؟

درمیان سے ایک سوال اٹھا، اس کا سُر کافی مدھم تھا لیکن تقریباً سن لیا گیا اور اس کی فوراً کاٹ بھی کی گئی۔

''اس طرح تو ہم نئے فساد بلکہ فسادوں کو جنم دیں گے۔ آخر ہم کس حیثیت میں کسی کے گھر کی تلاشی لیں گے — ؟ ہم کوئی سرکاری ہرکارے تو ہیں نہیں کہ ہمارے ہاتھوں میں قانون کی کتاب ہو اور پھر اس عمل سے فائدہ بھی کیا ہوگا — ؟''

''بھائی، سچی بات یہ ہے کہ اصل مجرم تو وہ آئینہ ہے جس نے یہ شرارت انجام دی......''

''یعنی یہ کہ اصل مجرم وہ ہتھیار ہوتا ہے جس سے قتل کی واردات انجام دی جاتی ہے۔ ہمارا یہی نقطۂ نظر رہا تو ہم مجرم کی نشاندہی کر چکے۔''

''لیکن وہ آئینہ تو آخر ڈھونڈنا ہوگا نا، جو اس جرم میں استعمال ہوا، اس کے بغیر ہم اپنے الزام کو آخر ثابت کیسے کریں گے......؟''

''وہ کون سا گھر ہے جہاں آئینے کا ایک ٹکڑا موجود نہیں ہوتا۔''

''یوں آئینے تو بولنے سے رہے، پھر اس کی پکڑ کیسے ممکن ہے......؟''

''بھائی — یہ مسئلہ تو الجھتا ہی جا رہا ہے۔ یہ تمام باتیں وہ ہیں جو ہمیں شروع ہی میں سوچ لینی چاہئے تھیں۔ اب تو ہم اتنے آگے بڑھ چکے ہیں کہ پیچھے ہٹنا ممکن ہی نہیں۔ اگر کچھ نہیں ہوا تو ہم منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں رہ جائیں گے......''

''سب اپنے طور پر اس سلسلے میں سوچیں، فی الحال اسے اٹھا رکھیں، لیکن سرد خانے میں ہرگز نہیں ڈالیں......''

اس طرح باتوں کا یہ سلسلہ بھی بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو گیا۔

کارخانے کی وسیع اور خوبصورت چہار دیواری چاہے باہر جو پیغام نشر کرے، مگر حقیقت یہی تھی کہ وہ یہاں مزدور تھا۔ ڈیوٹی کے پورے اوقات مشین پر مستعدی سے بیٹھا رہتا، پلک جھپکنے کی بھی فرصت نہ ملتی۔ ویسے وہ اپنے کام سے مطمئن تھا۔ مشین چلاتے چلاتے اس کی ہتھیلیوں میں گٹھے پڑ گئے تھے۔ ان گٹھوں کو دیکھتے ہوئے اکثر وہ سوچتا کہ اس کے اسلاف نے بھی محنت کی، محنت کی تعلیم دی اور محنت ہی کو باعث فخر قرار دیا۔ اس کی پشت پر محنت کے افتخار کا ایک بہت لمبا سلسلہ تھا، وہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ اس بات کی سوچ سے اس کے اندر طمانیت کا سمندر لہریں مارنے لگتا۔ وہ لاکھوں کروڑوں محنت کشوں میں سے ایک تھا اور جیسا بھی تھا، اپنے آپ کو اسی طرح دیکھتا تھا۔ اس کی

نگاہیں جسم کی دیواروں کے باہر کچھ نہیں دیکھتی تھیں۔شاید وہ اس کا اہل بھی نہیں تھا۔شاید یہ نگاہیں ان لوگوں کے پاس ہوتی ہیں جنہیں ہر چہار طرف سے فراغت نصیب ہوتی ہے اور وہ دیواروں کے باہر کی دیواروں کو دیکھنے کی خواہش پال لیتے ہیں۔

اس کی مشکل اس وقت شروع ہوئی جب اسے کھینچ تان کر دیواروں کے باہر کی وسیع دنیا میں دھکیلنے کی کوشش کی گئی۔وہ ہکا بکا رہ گیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اس میں ایسی کون سی خاص بات ہے جس کے سبب اسے اتنی اہمیت دی گئی۔

اس کی اپنی عقل جواب دینے سے قاصر ہوگئی تو اس نے دوسروں کی عقل کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ایسے لوگ جو اس کے خیال میں صاحب عقل تھے۔

انہوں نے خشمگیں نگاہوں سے اسے سر سے پیر تک گھورا۔مہندی سے رنگی اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا،صافے کو اپنے سر پر ٹھیک سے جمایا اور خشک لہجے میں بولے۔

''تمہیں اتنا بھی نہیں پتہ —— اسی لاعلمی کے سبب تو ہم دنیا میں ہر جگہ خوار ہو رہے ہیں، ہماری حیثیت مچھر کے برابر بھی نہیں رہ گئی۔''

وہ حونقوں کی طرح انہیں دیکھتا رہا۔

وہ کہنا کیا چاہتے تھے —— ؟

ان سے سوال کر کے وہ اور الجھ گیا تھا۔وہ بھی کچھ دیر تک اپنے ہی الفاظ کا اس کے چہرے پر تاثر پڑھنے کی کوشش کرتے رہے،ناکام ہو گئے تو پھر بولے۔

''عزیز گرامی،جو اپنے ماضی سے واقف نہ ہو،اس کا کیا حال اور کیا مستقبل......''

بات پھر اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔اسے محسوس ہوا کہ شاید اس کا وقت ضائع ہو رہا ہے اور ان کا بھی۔اس نے گوش گزار کیا۔

''میں ایک جاہل آدمی ہوں اور کم عقل بھی،مجھے سیدھے سادے الفاظ میں سمجھایا جائے

تو بڑی مہربانی ہوگی......"

"یہی تو بدنصیبی ہے ہماری قوم کی، جو بات انہیں سمجھنی چاہئے وہ نہیں سمجھتے، جو بات سمجھائی جاتی ہے، اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، خیر آپ یوں سمجھئے کہ آپ جو تن تنہا نظر آتے ہیں دراصل ہیں نہیں۔ آپ کے پیچھے آپ کا شاندار ماضی ہے، جس کا سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے۔ آپ اس لامتناہی طویل سلسلے سے الگ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ آپ اسی سلسلے کی کڑی ہیں، اکائی ہیں، آپ وہی کام انجام دیتے ہیں جو......"

اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس طول کلامی سے اپنے سے زیادہ وہ ان کا وقت ضائع کر رہا ہے۔ وہ اس کا مدعا سمجھ پا رہے ہیں نہ وہ ان کی باتیں سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اجازت کا طلبگار رہوا۔

انہوں نے بڑی خوش دلی سے اسے اجازت دے دی۔

"جائیے، ضرور جائیے۔ یقین ہے کہ آپ ہماری باتوں کو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔ تنہائی میں ان پر غور کیجئے گا، آپ کو فائدہ ہی فائدہ ہوگا......"

واپسی کا اس کا سفر پورے کا پورا سوچ میں غلطاں تھا۔ انہوں نے کیا کہا، کیا کہنا چاہا، کیا کہنا چاہتے تھے، اس کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔ یوں وہ کورا جاہل بھی نہیں تھا۔ اسکول اور کالج کے منہ اس نے دیکھے تھے۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا، وہاں اس سے زیادہ سوچنے پر، پَر جلنے لگتے تھے، حالانکہ کوئی ایسا بھی نکل آتا جو اپنے پَر جلا ہی لیتا۔ بہت سی دیکھی ان دیکھی حقیقی اور تصوراتی دیواروں کو پھاند جاتا اور بہت سے اپنے چراغ یوں روشن کرتے کہ کبھی تاریک چہرے روشن ہو جاتے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ کوئی چیز اس کے لئے باعث تقلید نہیں بن پاتی تھی۔ اسکول اور کالج کا منہ دیکھنے کے بعد اس نے کافی دنیا بھی دیکھی تھی۔ چھوٹی بڑی بہت سی باتوں کو سمجھ بھی لیتا لیکن بہت سی باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر بھی ہوتیں......

جیسے یہ باتیں......

وہ ان باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

سوچتا رہا۔

سوچتا رہا۔

اسے محسوس بھی نہیں ہوا کہ واپسی پر لاتعداد پر تجسس نگاہیں اس کا مسلسل تعاقب کر رہی تھیں، اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور پڑھ رہی تھیں ۔ اس کے دھیمے اور سوچ میں ڈوبے ہوئے قدموں کی رفتار کو گن رہی تھیں۔

چلتے چلتے وہ ٹکرا گیا۔

"کیوں بھائی، اپنے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھے ـــ ؟"

طنز سے بھرا ایک تیر اس کے وجود میں اتر گیا۔ وہ معذرت خواہ ہوا۔

"میں نے بالکل دیکھا نہیں بھائی، معاف کرنا......"

"ہاں جی، تمہاری بے دھیانی بے وجہ نہیں ہے......"

پھر طنز سے بھرا ایک تیر ـــ اس نے نظرانداز کر کے پھر معافی طلب کی۔

"غلطی ہو گئی بھائی، میں نے تمہیں بالکل نہیں دیکھا، ورنہ ایسا نہیں ہوتا۔"

"کمال ہے بھائی، تمہیں سامنے کی چیز نظر نہیں آتی ـــ ہاں بھائی ٹھیک ہی ہے، تمہیں تو دور کی چیزیں نظر آتی ہیں، نزدیک کی چیزیں کیوں دکھائی دیں گی ـــ ؟"

وہ شخص اس کا راستہ تقریباً روکے کھڑا رہا۔ اس کی نگاہیں اس پر سر سے پیر تک پڑ رہی تھیں اور پوری کی پوری شک و شبہ میں ڈوبی ہوئیں تھیں۔ اچانک اس کا ماتھا ٹھنکا۔

وہ اس سے کیا چاہتا تھا ـــ ؟

اس کی حرکت ہرگز ارادی نہیں تھی، وہ بے دھیانی میں اس سے ٹکرا گیا تھا، اس لئے بار بار

معافی مانگ رہا تھا لیکن وہ اس کی عاجزی اور انکساری کو دوسرے ہی انداز میں لے رہا تھا۔

آخر کیوں — ؟

کیا چاہتا تھا وہ — ؟

اسے بھی غصہ آ گیا۔

''کمال ہے صاحب آپ کا، میں آپ سے بار بار معافی مانگ رہا ہوں اور آپ ہیں کہ......''

اس کو کوئی فرق نہیں پڑا اور وہ بدستور عجیب نگاہوں سے اسے گھورتا رہا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی نگاہوں سے تیر نکل کر اس کے جسم میں پیوست ہو رہے ہیں۔ طنز، نفرت، شک وشبہ میں ڈوبے ہوئے تیر — وہ یوں شانت تھا اور جب اس نے اپنا جملہ کاٹا تب بھی اس کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ اس کے ہونٹوں پر ایک زہر خند طنزیہ مسکراہٹ بھی ابھر آئی۔

وہ آہستہ سے بولا۔

''تم کیا سمجھتے ہو، ہم کچھ جانتے ہی نہیں کہ ان دنوں تمہاری کیا نقل وحرکت ہے؟''

اس کا پارہ چڑھ گیا وہ تیز لہجے میں بولا۔

''کون سی نقل وحرکت — ؟ کیا نقل وحرکت — ؟ ذرا میں بھی تو جانوں، میں کیا کر رہا ہوں — ؟''

''جاننا چاہتے ہو — ؟''

اس نے غور سے اسے دیکھا۔ مارے بھناہٹ کے اس نے جواب بھی نہیں دیا اور اسے عصیلی نگاہوں سے گھورتا رہا۔ ان نگاہوں کا اس نے کیا مطلب نکالا، وہی جانے۔ شاید اس نے ان نگاہوں میں 'ہاں' پڑھا۔ بولا

''کیا تم اس شخص کے پاس نہیں گئے تھے — ؟''

''بالکل گیا تھا، کسی سے چھپ کر نہیں گیا تھا — ''

اس کا غصہ ابھی تک برقرار تھا۔ اسے رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا کہ وہ ایک خواہ مخواہ کے جھگڑے میں گھر گیا ہے۔ وہ دل سے نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کے بارے میں دل میں غلط خیال کو جنم دے۔

''کیوں گئے تھے ——؟''

اس کا انداز قابل رشک حد تک شانت تھا۔ اس خالص ذاتی سوال پر وہ اندر سے کھول گیا مگر اس وقت مصلحت یہی تھی کہ وہ اس کے ہر بے تکے سوال کا چپ چاپ جواب دیتا رہے۔

اس نے بہت سوچ کر جواب دیا۔

''اپنے آپ کو دریافت کرنے......''

وہ چونک اٹھا، اور اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں ناکام رہنے کے بعد اس نے پھر پوچھا۔

''اپنی بات کو کھول سکو گے ——؟''

وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ اس کا سارا تناؤ دور ہو گیا، شاید پورے کا پورا دوسری طرف منتقل ہو گیا۔ یہ دیکھ کر اس کی خوشی دو بالا ہو گئی، لیکن اس موقع پر اپنے آپ پر قابو رکھنا بھی ضروری تھا، سو اس نے یہی کیا اور دھیرے سے جواب دیا۔

''اپنے آپ کی دریافت بھی تو ایک چیز ہوتی ہے دوست، ویسے یہ چیز محسوس کرنے کی ہے، تم نے محسوس نہیں کیا اس لئے تمہیں یہ چیز اجنبی لگ رہی ہے ——''

اس کے قدرے تیکھے جملے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ بدستور اپنے شک وشبہ والے انداز میں بولا۔

''میں جانتا ہوں، تم بات کو دوسری طرف موڑنے کی کوشش کر رہے ہو لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم وہاں کیوں گئے تھے۔ تم ہمیں اتنا بیوقوف

کیوں سمجھتے ہو آخر......"

اسے کوئی غصہ نہیں آیا، بس خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اب اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا، سارے جواب اس نے دینے کی کوشش کی تھی۔

"آخر وہ ہمیں ان نگاہوں سے کیوں دیکھتے ہیں — ؟"

وہ تقریباً چیخ اٹھا۔ شاید وہ اس وقت جن لوگوں کے درمیان تھا، وہاں اس انداز میں بات کرنا بہت معیوب نہیں تھا۔

ان میں سے ایک نے سکون کے ساتھ جواب دیا۔

"زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، وہ ہمیں جن نگاہوں سے بھی دیکھیں، ہمارا کیا بگڑتا ہے......"

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ ان کی نگاہوں سے جو زہر آلود تیر نکلتے ہیں، وہ ہمارے جسم میں چھید کئے دیتے ہیں۔ اس طرح کوئی کب تک جی سکتا ہے بھلا، کوئی ایک دو دن کی بات نہیں......"

اس کا لہجہ خاصہ تیز تھا، کسی پر کوئی اثر دکھائی نہیں دیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ لوگ اس کے اس انداز سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔

وہ ان کے درمیان اس لئے گیا تھا کہ وہ بغور اس کی باتیں سنیں، اس کے جذبات کو سمجھیں اور اسے مطمئن کرنے کی کوشش کریں۔ مگر یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ وہ سب اس کی باتیں لاپروائی سے سنتے رہے۔ اس کی اندرونی کیفیت کو سمجھ بھی رہے ہوں گے لیکن ان کا تاثر بالکل مختلف تھا۔ ویسے بھی ان میں سے صرف ایک آدمی اس سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے اس کی بات کا جواب دیا۔

"بھائی، اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جتنا ہم اپنے بارے

میں جانتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ وہ جانتے ہیں۔ ہم نے تو اپنے آپ کو جاننے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی، جب کہ وہ اس پر باقاعدہ تحقیق کرتے ہیں، اس لئے ان کی نگاہوں میں شک وشبہ کا پیدا ہونا لازمی ہے......''

وہ حونقوں کی طرح سب کا منہ تکتا رہا۔ عجیب بات یہ تھی کہ کسی کی بات فوراً اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یا تو اس کی سمجھ کمزور تھی یا لوگوں کے بات چیت کرنے کا انداز ویسا تھا۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا، یہ بات بھی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ مزید باتوں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے آہستہ سے دریافت کیا۔

''پھر مجھے کیا کرنا چاہئے —— ؟''

اس پر وہ شخص بھی کچھ دیر کے لئے چپ ہو گیا، باقی تو پہلے سے چپ تھے ہی۔ پھر اس نے کھنکھار کر جواب دیا۔

''آپ ذرا لوگوں سے ملئے جلئے، اپنے ماحول میں وقت بتایئے، اپنی جڑوں کو پہچاننے کی کوشش کیجئے، اس کی آبیاری کیجئے، ہمیں یہ بات کبھی بھولنی نہیں چاہئے کہ ہماری پہچان دراصل یہی ہے۔ اس سے آگے اور اس کے علاوہ ہم کچھ بھی نہیں......''

اس نے پھر چپ چاپ اس کی باتیں سن لیں۔ اس کی الجھن بڑھ گئی تھی۔ اس کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ وہ دوسری مصروفیات میں اسے صرف کر سکے۔ جو وقت بچتا تھا اس میں کٹوتی کا مطلب تھا بال بچوں کا حق مارا جانا۔ اور ان کی بات ماننے کا مطلب تھا ایک عجیب پراسرار دھند میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونا۔ دونوں باتیں اس کے حلق سے نیچے نہیں اترتی تھیں۔ اس نے بہتر یہی سمجھا کہ اپنی اندرونی اور ذاتی باتیں ان کے گوش گزار کر دے، سو اس نے یہی کیا۔ مگر اس کی باتیں سن کر ان لوگوں کے چہرے پر بے اعتنائی کے تاثرات ابھرے۔ جو شخص اس سے گفتگو کرنے پر مامور تھا، اس نے خاصی رکھائی سے جواب دیا۔

''ہم تو آپ کو وہ راستہ بتا رہے ہیں جس سے آپ باعزت طور پر زندگی گزار سکیں۔ یہاں بھی کامیابی ملے، وہاں بھی۔ اب آپ ہیں کہ دو وقت کی روٹی کے لئے اپنا سب کچھ برباد کرنے پر تلے ہیں تو پھر جیسی آپ کی مرضی......''

اس نے بڑی بے بسی سے ان کی طرف دیکھا اور اپنا سوال پھر دہرایا۔

''تو پھر میں کیا کروں — ؟''

''بھیا، ابھی تک تمہیں یہ احساس نہیں ہوا کہ تم کون ہو — ؟''

سوال تیکھا تھا لیکن وہ نظر انداز کر گیا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''میں کون ہوں — ؟''

''تم — ؟ تم وہ ہو جس نے نہ صرف اس ملک پر بلکہ آدھی دنیا پر حکومت کی۔ تم سائنس، طب اور تہذیب کے امام رہے، تم نے دنیا کو بہت کچھ دیا بلکہ جو کچھ دیا، اسے ہی دنیا دھیرے دھیرے کھا رہی ہے، تم نے صرف اسی ملک میں......''

پتہ نہیں بولنے والا آگے کہاں تک جاتا، اگر وہ روک نہ دیتا۔

''لیکن ابھی تو ساری دنیا پر دوسروں کی حکومت ہے — ؟''

''یہی تو اصل بات ہے — ''

جواب بالکل تیار تھا —

''سوچنے کی بات تو یہی ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا — ؟ جب ہم آدھی دنیا کو فتح کر چکے تھے تو پھر ساری دنیا کو فتح کیوں نہیں کر سکے — ؟ ایسا کیوں ہوا کہ آدھی دنیا بھی ہمارے ہاتھوں سے نکل گئی......''

''تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے — ؟''

اس نے تیسری بار سوال دہرایا۔ عجیب بات تھی کہ اُس کے بار بار ایک ہی سوال کرنے سے کوئی جھنجھلا نہیں رہا تھا اور قرائن بتا رہے تھے کہ وہ آگے بھی یہی سوال کرے گا تو وہ

اس سے لطف اندوز ہی ہوں گے۔
بہت حلیمی کے ساتھ جواب دیا گیا۔
''آپ اپنے آپ کو اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھئے۔آپ علیحدہ کوئی چیز نہیں ہیں۔اپنے اندر اس احساس کو زندہ کیجئے......اس احساس کو جو ہماری بداعمالیوں کے سبب مردہ ہو چکا ہے،آپ محکوم نہیں حاکم ہیں۔کم سے کم احساس کی حد تک تو یہ چیز ہمارے اندر زندہ رہنا ہی چاہیئے۔آگے راستے خود بخود کھلتے جائیں گے......''
وہ وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔چوتھی بار اس کی زبان نے شاید اس سوال کو دہرانے سے انکار کر دیا تھا۔

اس نے ٹھنڈے دل سے ان باتوں پر غور کیا تو اسے ان میں وزن نظر آیا۔
''وہ کچھ غلط تو نہیں کہتے۔میں تو واقعی کچھ نہیں جانتا......اپنے آپ کے بارے میں تو بالکل ہی نہیں۔اس میں قصور تو سراسر میرا ہی ہے۔یہی لاعلمی آج ہماری ذلت کا سب سے بڑا سبب ہے۔ہم نے اپنے آپ کو روٹی پکانے کی بھٹی میں جھونک دیا،ہم بھٹی کا کوئلہ بن گئے جب کہ ہم وہ ہیرا ہیں جو کبھی دنیا کو خیرہ کرتے تھے۔آج اس ہیرے پر اتنی دھول پڑ گئی کہ وہ دکھائی بھی نہیں دیتا۔لیکن اس سے کیا ہوتا ہے،ہیرا تو ہیرا ہی ہے۔دھول پڑ جانے سے وہ بدل تو نہیں جاتا۔دھول جھاڑنے بھر کی دیر ہے اور بس۔

وہ تقریباً بھول چکا تھا۔
لگ بھگ سبھی بھول چکے تھے۔
لیکن اکا دکا ایسے بھی تھے جن کے دلوں سے یہ چیز محو نہیں ہو سکی تھی،چنانچہ موقع دیکھ کر انہوں نے چھیڑ دیا۔
''ہماری وہ محنت رائیگاں چلی جائے گی کیا ــــ؟ جب ہم اس معاملے کو پایۂ تکمیل

تک نہیں پہنچا سکے اور اپنے حق میں فیصلہ نہیں کرا سکے تو پھر ضرورت کیا تھی بات آگے بڑھانے کی — ؟''

لوگ چونک اٹھے۔ جس لہجے میں مخاطبت کی گئی تھی اس نے ان کے لاشعور پر اتنی کاری ضرب لگائی کہ بھولی بسری بات انہیں ایک دم یاد آ گئی۔

''بات تو صحیح ہے۔ ہم تو بہت آگے چلے گئے تھے۔ کوئی دوسرا ہمیں پیچھے ہٹنے کو کہتا تو شاید ہم مارنے مرنے پر تیار ہو جاتے، ہم خود پیچھے ہٹ گئے اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں......''

نہلے پر دہلہ......کچھ دیر کی معنی خیز خاموشی — پھر —

''بھائی، مشکل یہ ہے کہ سب ایک دوسرے کو الزام دیتے ہیں، خود سے آگے کوئی قدم نہیں بڑھاتا، بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کو تیار نہیں ہوتا — ''

''وہ اس لئے کہ ہمارے اندر will power کی بہت کمی ہے، یہ چیز ہوتی تو اس مسئلے کا حل کوئی مشکل نہیں تھا......''

''اس باب کو ایک بار پھر کھولتے ہیں — نئے سرے سے......''

''وہ کس طرح — ؟ اور اس کا فائدہ — ؟''

یہ سوال تو صرف ایک شخص کی زبان سے ادا ہوا تھا، لیکن سب کی نگاہ بتا رہی تھی کہ یہ سب کے دلوں کی بات تھی۔

''وہ اس طرح کہ سارے سلسلے کی کڑیاں ایک بار پھر جوڑیں، اس راستے کا سفر ایک بار پھر اختیار کریں اور پھر دیکھیں کہ شاید کوئی راستہ نکل ہی آئے......''

''اگر اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچا ہے تو بسم اللہ......''

''بات یوں شروع ہوئی تھی کہ سلیم کو کسی نے راہ چلتے آئینہ دکھایا تھا۔''

''کوئی خاص بات نہیں، ہم روز اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتے ہیں، پھر دوسرے کے دکھانے

پر اعتراض کیوں ـــ ؟ یہ واقعہ اتفاقی بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''یہی تو اصل بات ہے۔ ایک تو یہ واقعہ اتفاقی ہرگز نہیں ہے کیوں کہ دوسرے دن بھی یہی چیز دہرائی گئی تھی جس سے شرارت کی نیت صاف جھلکتی ہے، پھر آئینہ کو دھوپ کی شعاع سے ٹکرا کر تیز روشنی پیدا کی گئی تھی جس سے آنکھیں ضائع ہونے کا خطرہ بھی تھا......''

''کوئی اپنی کھڑکی پر آئینہ لے کر کھڑا ہو تو لازماً اس کا واسطہ دھوپ کی شعاعوں سے پڑے گا۔ اس سے یقیناً تیز روشنی پیدا ہوگی۔ فطری طور پر یہ روشنی کسی کے چہرے یا جسم پر بھی پڑے گی، پھر کیا ضروری ہے کہ اس کا نشانہ میاں سلیم ہی ہوں......؟''

بحث کرنے والا شاید غیر ارادی طور پر مخالف کٹہرے میں جا کھڑا ہوا تھا جس سے کچھ لوگوں کے چہرے پر پریشانی اور پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''اس قسم کی باتیں تو دشمنوں کو تقویت پہنچائیں گی۔''

''یہاں دشمن ہے کہاں جو کسی طرح تقویت پائے لیکن اپنے لوگوں کے درمیان کھل کر باتیں ہونی ضروری ہیں تاکہ تاریکی میں روشنی کی کوئی کرن نظر تو آئے......''

''اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بات اتنی آگے جا چکی ہے کہ اب پیچھے نہیں ہٹا جا سکتا، تاریکی میں روشنی نظر آئے تب بھی......''

''ہم تو ایک جگہ پر جامد و ساکت ہیں، نہ آگے بڑھتے ہیں نہ پیچھے ہٹتے ہیں۔ ابھی تو ہمیں یہی سوچنا ہے کہ ہم اس سکوت کو کیسے توڑیں......''

''آخر ہم نے آپس میں اتنی باتیں کیں، ان لوگوں کے پاس اس معاملے کو لے گئے، اتنے بڑے لیڈر کے پاس جا پہنچے تو بات تو آگے ہی بڑھی ہے، اسے ہم جامد و ساکت تو ہرگز نہیں کہہ سکتے......''

آواز ایک ہی تھی اور کافی بلند تھی اور اسے کسی نے کاٹا بھی نہیں، اس کا جواب حلیمی سے دیا جانا تھا سو دیا گیا۔

''یہ اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس تگ ودو کا نتیجہ کیا نکلا — ؟''
یا تو ہم مجرم کو پکڑ کے ان کے حوالے کردیں یا پھر اپنی شکایت واپس لے لیں۔
تنہا آواز لیکن مضبوط —
''یہ تو اب ممکن ہی نہیں۔ واپس لینے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے ایک غلط روایت جنم لے گی۔ پھر کبھی ہم مضبوطی سے کوئی شکایت درج نہیں کرا سکتے۔ کسی طرح کرا بھی لیا تو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ہمت نہیں حاصل کر سکتے۔ سوال پیچھے دیکھنے کا نہیں، صرف اور صرف آگے دیکھنے کا ہے......''
دونوں خیمے مضبوطی سے اپنی اپنی جگہ تن گئے، نگران میں سے ایک واضح طور پر کمزور تھا اور دوسرا......''
کمزور خیمے سے آواز اٹھی۔
''تو اب براہ مہربانی آپ ہی رہنمائی فرمایئے......''
مجرم کو ہر حال میں ڈھونڈنا ہوگا اور یہ کام صرف ہمیں ہی انجام دینا ہے، مجرم ہمارے ہاتھوں میں آجائے گا تو یہ ہماری ایک بڑی کامیابی ہوگی لیکن سزا ہم انہیں کے ہاتھوں سے دلوائیں گے، یہ زیادہ بڑی کامیابی ہوگی۔''
''اب مزید کچھ اظہار خیال کرنے کی ضرورت نہیں، اب تو بس یہ ہے کہ نکل چلئے......''

اس کام کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ یہ بجائے خود ایک بہت ہی مشکل کام تھا۔ یہ ایک ایسی کمیٹی تھی جس میں کوئی بھی اپنی خوشی سے رہنا نہیں چاہتا تھا۔ 'الف'، 'ب' کا نام پیش کرتا تو 'ب' فوراً انکار کر دیتا اور اپنی جگہ 'الف' ہی کا نام پیش کر دیتا، پھر 'الف' بھی اس سے انکار کرتا۔ یہ سلسلہ 'الف' سے 'ی' تک چلا۔ یہ تشکیل اور رد تشکیل کا ایک عجیب وغریب مرحلہ تھا، جس میں ہر شخص اپنی شمولیت سے انکار کرتا تھا۔ آخر بڑی بڑی

مشکلوں اور دقتوں سے تین آدمیوں کی کمیٹی تشکیل پاسکی۔

پھر مرحلہ درپیش ہوا کمیٹی کے کام کرنے کا۔ اصل میں شروع سے ہی یہ واضح نہیں تھا کہ کمیٹی کو کام کون سا انجام دینا ہے۔ کمیٹی نے کئی بار پیشکش کی، لمبی لمبی بحثیں ہوئی، نتیجہ ڈھاک کے تین پات۔ کمیٹی کے ممبران کو خود بھی کمیٹی کی تشکیل و تجویز پر اعتراض ہوا۔

''کمیٹی کی تشکیل کا اس کے سوا کوئی مقصد نہیں کہ سب کی پریشانیاں سمٹ سمٹا کر ہم لوگوں تک محدود ہو جائیں۔ وہ لوگ چین کی بانسری بجاتے ہیں اور ہم......''

''جو کام انہوں نے ہمیں سونپا، وہی کام وہ سب مل کر بھی تو انجام دے سکتے تھے......''

''کمیٹی ویٹی کی تشکیل اسی لئے تو ہوئی ہے کہ سب کی زبانیں بند ہو جائیں، انہیں نفسیاتی تسکین بھی ہو جائے اور کوئی ٹھوس نتیجہ بھی نہ نکلے......''

''خیر، اب تو یہ ہے کہ کیا کیا جائے۔ کمیٹی تو بن چکی، ہم خوشی یا ناخوشی اس میں شامل بھی ہو چکے۔ ہمیں یہ تو ثابت کرنا ہی ہوگا کہ ہم کام کرنے والے لوگ ہیں......''

''ہمارا کام صرف یہی ہے نا کہ ہم کسی طرح مجرم کی نشاندہی کر کے انصاف کی کرسی کو خبر کر دیں اور بس......''

''تو تم یوں کہہ رہے ہو بھائی جیسے یہ کام بس چٹکی بجانے بھر ہے۔ اصل کام تو انہوں نے ہمیں سونپ دیا اور خود بڑے اطمینان سے انصاف کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ مجرم سامنے آ بھی جائے گا تو اسے سزا دلانے میں کیا دیر لگے گی......''

''ہم باتیں ہی کرتے رہیں گے یا کچھ آگے بھی بڑھیں گے......''

اکتائی ہوئی آواز نے کچھ نہ کچھ بولنے کی سب کی خواہش کا گلا گھونٹ دیا اور صورت حال سنجیدگی کی طرف مڑ گئی۔

''وہ آئینہ مل جائے تو ہمارا کام بہت آسان ہو جائے گا......''

ایک دھیمی آواز۔

''یہ تو مرغی سے پہلے انڈا پیدا کرنے والی بات ہوئی۔ آخر وہ کون سا ایسا گھر ہے جہاں آئینہ یا آئینے کا ٹکڑا نہ ہوگا، پھر یہ ثابت کرنا کہ اسی آئینے سے یہ کام انجام دیا گیا، آئینہ تو گویا ہونے سے رہا......''

''یہ تو کوئی آدمی بھی قبول نہیں کرے گا کہ اس نے یہ کام انجام دیا، پھر......؟''

کٹھن سوال......

لیکن اب لوگ کچھ کر کے ہی یہاں سے اٹھنا چاہتے تھے، اس لئے تھوڑی دیر ہراساں تو ہوئے لیکن ہمت نہیں ہاری۔ ایک تجویز سامنے آئی۔

''کیوں نہ ہم لوگ پہلے جائے وقوع کا معائنہ کریں، کچھ مقامی لوگوں سے بات کریں، شاید کچھ سامنے آجائے...... کسی چیز کا سرا...... یہ تجویز ایسی تھی کہ کوئی دوسری تجویز نہ آنے سے بہر حال بہتر تھی، اس لئے اس وقت اسی پر اتفاق ہوا اور سب لوگ اگلی امید کا ایک موہوم سرا تھامے ہوئے اٹھ گئے۔

پہلے پہل مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے جھجک محسوس ہوئی تھی۔

کیوں ــــ ؟

یہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایسا راستہ اختیار کرتا جس میں کوئی مسجد آتی ہی نہ ہو، خاص طور پر اس وقت جب کسی نماز کا وقت بھی ہو، اصل میں اس وقت مسجد جانے والوں میں کوئی ایک ایسا ضرور ہوتا جو اس کا جاننے والا نظر آتا، اس سے آنکھ چار کرتے ہوئے اسے خواہ مخواہ کی شرم آتی۔ یوں اس سے کوئی کچھ کہتا نہیں تھا، لیکن جب ایسا موقع آتا، اس کا سر جھک جاتا اور وہ جھکے جھکے آگے نکل جاتا۔ کئی بار اس نے بھی سوچا کہ اسے مسجد جانا چاہئے۔ اس کے بھی جاننے والے اس کے سبھی دوست، رشتہ دار مسجد جاتے ہیں۔ کئی بار اس نے کوشش بھی کی کہ اپنے ارادے پر عمل پیرا ہو، لیکن برا ہو اس کی بے پناہ مصروفیت کا کہ چاہتے ہوئے بھی وہ ایسا نہیں کر سکا۔ لیکن در پیش حالات کے پیش نظر وہ اس لائن

پر سوچنے پر مجبور ہوا کہ بہر اٹھا کر زندہ رہنا ہے تو صرف روزی روٹی سے کام نہیں چلے گا، اس کے لئے اپنے آپ کو پہچاننا ہوگا اور اس پہچان کو حاصل کرنے کے لئے اپنی جڑوں تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہوگی۔

وہ جہاں بھی جاتا، جس سے بھی باتیں کرتا، جن حالات سے بھی دوچار ہوتا، سب کا نتیجہ تقریباً ایک ہی نکلتا...... اپنی پہچان۔ اسے کبھی کسی نے صاف لفظوں میں یہ نہیں کہا کہ وہ یہ کرے، وہ یہ نہ کرے، ساری باتیں مبہم انداز میں اس کے سامنے آئی تھیں اور سارے فیصلے اس پر چھوڑ دئے گئے تھے۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کے جیسے دوسرے آدمیوں کی جو پہچان ہے، وہی اسے بھی اپنانی ہوگی۔ وہ جب ان لوگوں کے درمیان جمع ہے تو الگ سے اس کی پہچان کوئی معنی نہیں رکھتی۔ وہ الگ ہونے اور الگ دکھائی دینے کی کوشش بھی کرے تو اسے کوئی الگ نہیں مان سکتا۔

اس نے اپنے اوقات کی از سرنو ترتیب دی۔ اس میں کچھ کوششوں کے بعد جمعہ کی نماز کا وقت نکل آیا۔ اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ کسی طرح جمعہ کی نماز میں ضرور شریک ہوگا۔

مسجد آنے جانے، لوگوں سے ملنے جلنے اور سب کے ساتھ ایک ہی قسم کی باتیں کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اتنے دنوں میں وہ خواہ مخواہ درخت سے کٹے ہوئے پتے کی طرح ڈولتا رہا، جسے ہوا کا ایک جھونکا جب اور جہاں چاہتا اڑا کر لے جاتا۔ اپنی جڑوں سے الگ ہو کر وہ خواہ مخواہ غیر اہم بنا رہا۔ اب جب کہ اس نے اپنی جڑوں تک پہنچنے کی کوشش کی تو اس کے اندر یہ احساس جاگ اٹھا کہ وہ اتنا غیر اہم بھی نہیں ہے۔ وہ تقریباً پہلی بار ان کے درمیان گیا تھا، اسے یہ یاد بھی نہیں تھا کہ وہ کب ان کے درمیان گیا تھا مگر اس نے بالکل اجنبیت محسوس نہیں کی۔ لوگ اس سے یوں گھل مل گئے یا وہ ان میں یوں رل گیا کہ دور دور تک اس کا شائبہ بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی ان سے الگ بھی تھا۔

وہ جو کچھ کر رہے تھے، ان میں وہ یوں شامل ہو گیا جیسے وہ بہت پہلے سے ان کے ساتھ اس عمل میں مصروف تھا۔ وہ جو باتیں کر رہے تھے ان میں یوں شریک ہو گیا جیسے وہ ان باتوں کا پہلے سے حصہ ہو۔

وہ ان کے درمیان یوں اٹھنے بیٹھنے لگا جیسے برسوں سے ان کے درمیان ہو۔

اسے افسوس ہوا کہ وہ بہت تاخیر سے ان میں شریک ہوا۔ یا پھر یوں کہ اسے اپنی شرکت کا دیر میں احساس ہوا، ورنہ وہ تو جانے انجانے بہت پہلے سے ان کا حصہ تھا...... اٹوٹ حصہ......

اس نے گویا تجربے کے طور پر اپنے وقت کی یوں ترتیب کی تھی کہ ہفتے میں ایک ساعت، اس کے لئے نکال لی تھی لیکن اس کے مزاج، حالات اور سوچ نے دھیرے سے یوں کروٹ لے لی کہ اسے پتہ بھی نہیں چلا اور اس کے پاس اتنا وقت نکل آیا کہ وہ نہ صرف جمعہ کی نماز میں باقاعدگی سے شریک ہونے لگا بلکہ اکثر صبح اور عشاء کی نمازوں میں بھی جانے لگا۔ اسے یہ جان کر سخت تعجب ہوا کہ اس کے پاس اتنا وقت تھا، یعنی وہ خواہ مخواہ اپنا وقت محض روزی روٹی کے چکر میں ضائع کرتا رہا۔ اس کے پاس تو اتنا وقت تھا کہ وہ اپنے کام کی جگہ ہی پر ظہر، عصر اور کبھی کبھی مغرب کی نمازیں بھی ادا کرنے لگا۔ فرق صرف یہ ہوا کہ وہ بہت سے فضول کاموں اور فضول باتوں سے دور ہو گیا، جنہیں لوگ اپنی سمجھ کے مطابق سماجی کاموں اور سماجی رشتوں کا نام دیتے تھے۔

اسے شدت سے محسوس ہوا کہ اتنے دنوں الگ رہ کر اس نے اپنا ہی نقصان کیا، وہ تو ایک عظیم سلسلے کی کڑی تھا، حالات مجبور نہ کرتے تو وہ آج بھی کٹی پتنگ کی طرح ادھر ادھر ڈولتا رہتا اور ہوا کا ایک ہلکا جھونکا جہاں چاہتا، اڑا کر لے جاتا۔ اس کی کمر میں کوئی بھاری پتھر نہیں بندھ گیا تھا لیکن وہ اب اتنا ہلکا بھی نہیں رہا۔ ہوا کا کوئی من موجی جھونکا اسے اپنی مرضی کے مطابق اڑا کر اب کہیں لے نہیں جا سکتا تھا۔

''آئینہ......؟''

لوگوں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ — ؟ بھلا کوئی خواہ مخواہ کسی کو آئینہ کیوں دکھانے لگا — ؟
آپ نے اس بات پر یقین کیسے کرلیا اور اس آئینے کی تلاش میں نکل کیسے پڑے — ؟''

ان کی نگاہوں میں حیرت کے علاوہ مضحکہ خیزی، نا اعتباری اور کسی حد تک حقارت کے رنگ لحظہ لحظہ ابھرتے رہے۔ جواب میں ان لوگوں نے ان کی نگاہوں کے حروف کو حرف غلط سمجھ کر سنجیدگی اور حلیمی کے ساتھ عرض کیا کہ یہ معاملہ اب کافی طول پکڑ چکا ہے، اونچی سطح پر انصاف کی دہائی لگائی جا چکی ہے اس لئے فی الوقت آئینہ اور اس کے استعمال کرنے والوں کی تلاش ہی اصل مسئلہ ہے اور ذمہ دار شہریوں کی طرح انہیں ان سے تعاون کرنا چاہئے۔

اس پر انہوں نے آپس میں تھوڑی دیر صلاح مشورہ کیا پھر ان کے نمائندے یا لیڈر نے بڑے خلوص کے ساتھ مطلع کیا کہ ان سے جو مدد چاہیں، وہ دینے کے لئے تیار ہیں۔

اس غیر متوقع جواب پر وہ سخت حیرت میں پڑ گئے اور انہیں پھر فوری طور پر آپس میں صلاح مشورے کی ضرورت پڑ گئی۔

کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ ان کی غیر متوقع کامیابی ہے۔ انہوں نے آئینہ اور آئینہ دار کی تلاش میں انہیں کھلی چھوٹ دے دی ہے اور اس سے فوراً فائدہ اٹھانا چاہئے۔

جب کہ کچھ لوگ کہتے تھے کہ جس ڈھنگ سے وہ فوری طور پر تلاش کے لئے تیار ہوئے ہیں اس میں ضرور کوئی سازش پوشیدہ ہے، لہٰذا ہمیں بہت سوچ سمجھ کر ان کی بات قبول کرنی چاہئے۔

کچھ کا خیال تھا کہ دراصل وہ اس لئے اتنی آسانی سے راضی ہوئے ہیں کہ یہ چیز کبھی ممکن ہی نہیں۔

تمام اظہار رائے دراصل ان کی نفسیاتی تسکین کا وسیلہ تھا کیوں کہ وہ جس راستے پر چل رہے تھے، وہ بہت ٹیڑھا میڑھا اور سست رفتار سہی، مگر اس میں واپسی کا راستہ نہیں آتا تھا یعنی آگے کا راستہ بند۔ اس لئے سیدھی بات یہ ٹھہری کہ انہیں اس آفر کو قبول کرنا ہی نہیں تھا۔

چنانچہ ایک دن تاریخ اور وقت مقرر کر کے وہ اس جگہ پر جا پہنچے۔ وہاں سب کچھ عام دنوں جیسا ہی تھا یعنی جو ایک مصروف شاہراہ پر ہوتا ہے۔

جو بڑے تھے وہ آ رہے تھے، جا رہے تھے، ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے، خرید و فروخت کر رہے تھے۔

جو بچے تھے، وہ سڑکوں اور گلیوں میں سائیکل کے ٹائروں، ٹین کے ڈبوں، پرانی چپلوں اور کاغذ کی دھجیوں سے کھیل رہے تھے۔ جو درمیان کے لوگ تھے یعنی بڑے نہ چھوٹے وہ بند دکانوں کے تھڑوں پر تاش اور لوڈو سے دل بہلا رہے تھے، جو ان سے تھوڑا بڑے تھے وہ کونوں میں کچھ جگہ نکال کر کیرم کی ٹیم بنائے ہوئے تھے، کچھ خوانچے والے اپنے اپنے سامان بیچ رہے تھے، کچھ لوگ خرید رہے تھے، کچھ ان سے چھیڑ خوانی کر رہے تھے۔

سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔

وہ ادھر ادھر ٹہل کر سوچتے رہے کہ کام کیسے شروع کیا جائے۔ کسی ایک جگہ پر کھڑے ہو کر مشورہ بھی نہیں کر سکتے تھے، پھر وہاں پر بھیڑ لگ جاتی سبھی انفرادی طور پر کچھ سوچنے پر مجبور تھے۔

بارے ان میں سے ایک نے ایک دروازے پر دستک دی۔ دوسروں کے سوچنے کی رفتار وہیں رک گئی۔ سبھی دھیرے سے وہیں سرک آئے۔

دروازہ کھلا، ایک بچے نے انہیں سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”بیٹے، گھر میں کوئی بڑا ہے کیا ـــــ؟“

''ماں......!''

بچے نے مختصر لیکن فوری جواب دیا۔ اس پر سوال کرنے والے کو فوراً کوئی بات نہیں سوجھی، اسی دم پتہ نہیں کہاں سے گھر کے اندر اور آس پاس سے کچھ عورتیں آ گئیں اور اجنبیوں کو دیکھ کر عجیب انداز سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔

انہوں نے جلدی سے وضاحت کی۔

''دیکھئے، گھبرانے کی بات نہیں، ہم سرکاری لوگ نہیں ہیں، ہم بس یہ پتہ لگانے آئے ہیں کہ......''

انہوں نے مختصراً پورا واقعہ اور اس سے جنم لینے والے مسائل بیان کر دیئے۔ وہ بھونچکا سی ان کی شکلیں دیکھنے لگیں۔ کچھ کھسر پھسر بھی ہونے لگی، کچھ نے خواہ مخواہ کی ہنسی کو دبانے کی کوشش میں منہ پر پلو رکھ لئے۔

ان کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ آگے کیا کریں۔ آئینہ کی بات کرتے ہیں تو کون سا گھر ہے جہاں آئینہ موجود نہیں۔ ملزم کی بات کرتے ہیں تو کون ہے جو الزام کو اپنی پیشانی پر لکھوا رکھے۔

انہیں خاموش اور گومگو حالت میں دیکھ کر وہاں عورتوں کی بھیڑ بڑھنے لگی۔ ان کی نگاہوں میں عجیب قسم کا شک وشبہ تھا۔ کچھ بوڑھے اور بچے بھی آ گئے، اکا دکا جوان بھی۔ انہوں نے ایک نامعلوم خطرہ محسوس کر کے جلدی سے کہا۔

''کوئی ایسی بات نہیں، ہم آپ کے مردوں سے بات کر چکے ہیں، اب ان کی موجودگی ہی میں آئیں گے......''

خوش قسمتی سے وہ آسانی کے ساتھ نکل آئے۔ ایک جگہ بیٹھ کر انہوں نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

''یہ عورتیں بڑی ناسمجھ تھیں۔ ہمارا آسانی سے نکل آنا بہت اچھا ہوا......''

''ہم یوں ہی اندھیرے ہی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔آخر ہم کس چیز کی تلاش میں وہاں گئے تھے ــــ کیا ہم ملزم کو پکڑ لیں گے ــــ ؟''

''بھائی میرے، یہ بات تو شروع ہی میں سوچ لینی چاہئے تھی، ہم تو شروع ہی سے ہوا میں تلوار بھانج رہے ہیں۔اس کا جو نتیجہ ہونا تھا، وہ ہوا......''

''تو اب کیا ہو......؟''

نوے فیصد لوگوں کی زبان پر یہی تھا۔دس فیصد نے خاموشی کو راہ دی،لیکن ان کی پرسکون خاموشی اس بات کا مظہر تھی کہ وہ بھی نوے فیصد سے متفق ہیں۔

''اس معاملے کو یہیں چھوڑ دینے کے سوا اور کیا چارا ہے۔یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں، حالات کہہ رہے ہیں۔ وہ حالات جو ہمیں چاروں طرف سے گھیر چکے ہیں یا یوں کہا جائے کہ انجانے میں ہم......''

''اس قسم کی نیم رومانی اور نیم ادبی باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔تم نے سوچا، کتنی بڑی بات کہہ دی تم نے ــــ ؟ ہم چند لوگ یہ فیصلہ کرنے کا حق ہی نہیں رکھتے، پھر ہم سب کو اتفاق رائے سے اس فرض کو انجام دینے کے لئے مقرر کیا گیا ہے اس موقع پر اس طرح بھاگ نکلنے کی کوشش غداری کے مترادف ہوگی......''

سوچ کو ایک بار پھر روک لگی۔سب کی زبانیں چپ ہوگئیں۔ایک ٹھہراؤ سا آگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد برف پگھلی تو سامنے کچھ دھندلا دھندلا سا نظر آنے لگا۔

''جب ہم اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتے تو پھر ان کے اعتماد پر بیٹھے رہنے کا کیا حاصل......؟''

''کبھی کبھی وقت بھی کسی حل نہ ہونے والے مسئلے کو اپنے طور پر حل کر دیتا ہے......''

''وقت ــــ ؟؟''

سب کی زبانوں سے بیک وقت نکلا۔یوں جیسے انہوں نے اچانک وقت کو اپنے سامنے

کھڑا دیکھ لیا ہوا۔

وہ چپ چاپ وقت کو گھورتے رہے۔

مسجد میں باقاعدگی سے آنے جانے، چھوٹی چھوٹی باتوں میں دلچسپی لینے کے سبب پہلے تو وہ لوگوں کی نگاہوں کے دائرے میں آیا، پھر بہت آہستگی سے اس نے ان آنکھوں میں مرکزی مقام حاصل کر لیا۔

ان میں تقریباً سبھی لوگ باقاعدگی سے مسجد آنے والے نہیں تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب ان کا ایک گروپ آتا تو اسے مسجد میں پاتا، دوسرا گروپ آتا تو وہ بھی پاتا، تیسرا گروپ ...... یہاں تک کہ سب لوگوں نے اس کی باقاعدگی کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی۔ پھر جب سب اکٹھے ہوئے تو مرکزی دائرے میں وہی تھا۔

سب اس کی تعریفیں کر رہے تھے۔ یہ کسی نے محسوس نہیں کیا کہ اس کے لئے اس نے کتنی قربانیاں دی ہیں۔ اپنی بہت سی جا و بیجا خواہشوں پر قابو پایا ہے۔ اپنی کتنی مصروفیات کو بالائے طاق رکھا اور اپنے اوقات کی کس طرح قربانی دی......

وقت کی قربانی......

دنیا کی سب سے بڑی قربانی............ لیکن جو لوگوں کو سب سے کمتر اور حقیر قربانی نظر آتی ہے۔

شاید اسے خود بھی پتہ نہیں تھا کہ اس نے کون سی قربانی دے کر سرخروئی حاصل کی ہے۔

کبھی جب وہ سویرے مسجد میں آجاتا تو مسجد کی چھوٹی چھوٹی خدمت بھی انجام دے دیتا۔ مثلاً کبھی جالا نظر آتا تو اسے صاف کر دیتا، گرد و غبار کو جھاڑ دیتا، جائے نماز کی شکنیں درست کر دیتا، منبر کو جھاڑ پونچھ کر چمکا دیتا، وضو خانے میں ادھر ادھر پھیلے پانی کو سمیٹ کر زمین کو خشک کر دیتا وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ ان چھوٹی چھوٹی خدمت کے لئے دوسرے بھی

موجود تھے لیکن یا تو ان باتوں پر ان کی نگاہیں نہیں پڑتی تھیں یا پھر کیا بات تھی، وہی جانیں۔ اس کو یہ سب کرتے دیکھ کر لوگوں کو حیرت بھی ہوتی، خوشی بھی، ساتھ ہی تنخواہ داروں کی غیر ذمہ داریوں پر افسوس بھی ہوتا۔

اگلی بار مسجد کی مجلس منتظمہ کی تشکیل ہونے لگی تو اتفاق رائے سے اسے بھی اس کا ممبر بنایا گیا۔ یوں زندگی میں پہلی بار اس کی شخصیت کا لاشعوری طور پر اعتراف کیا گیا۔ اس رات مارے خوشی کے اسے نیند نہیں آئی۔ اسے محسوس ہوتا رہا کہ وہ زمین سے کچھ اوپر اٹھ گیا ہے۔ زمین پر چلنے والے بیشمار لوگوں میں وہ ممتاز ہے، اس کی اپنی ایک حیثیت ہے۔ وہ جیسے کسی تخت پر بٹھا دیا گیا ہو، اس کے سامنے بہت سے لوگ ہاتھ باندھے کھڑے ہوں۔ اسے وہ قصہ یاد آیا جس میں کسی ملک کا بادشاہ مر گیا اور طے پایا کہ جو پہلا شخص ملک میں داخل ہو اسے تاج پہنا دیا جائے۔ شاید اس ملک میں داخل ہونے والا پہلا شخص وہی ہے۔ لوگ اسی کے لئے تاج اپنے ہاتھوں میں لئے منتظر تھے۔

وہ خوشی میں اچھی طرح مغلوب ہو چکا اور اس کی بوند بوند کو اپنی رگ و پے میں اتار چکا تو اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس پر تو بڑی ذمہ داری لاد دی گئی ہے...... ذمہ داری بھی کوئی دنیاوی نہیں، خدا کے گھر کی ذمہ داری...... ذرا بھی چوک ہو تو خدا کے سامنے جواب دہ...... ذمہ داری سے اچھی طرح عہدہ برآ ہوئے تو دنیا کے ساتھ ساتھ خدا کی خوشنودی بھی حاصل ہو جائے۔

اس کے اندر خوشی کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کی طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے طے کر لیا کہ اپنے کام کے بعد اس کے پاس جو بھی وقت بچے گا، وہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں لگا دے گا۔ لوگوں نے اسے چنا ہے تو کچھ سوچ کر ہی چنا ہوگا، اسے بھی ان کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہ تو محض خدا کی مہربانی ہے کہ اس نے

اسے یوں سرخروئی عطا فرمائی۔ وہ لوگوں سے بہت مختلف ہے۔ سب لوگوں کے ساتھ چلتے ہوئے بھی اس کے قدم سب سے آگے آگے ہیں۔ یہ سب کچھ اچانک ہی ہوا ہے اس کے ساتھ۔

ممبر ہونے کے بعد وہ پہلی بار مسجد پہنچا تو جیسے کوئی پہلے دن اپنے دفتر پہنچتا ہے۔ اس کی توقع کے برخلاف موذن نے دوڑ کر اسے سلام نہیں کیا بلکہ قدرے تاخیر سے اس کے پاس آیا تو یوں 'السلام علیکم' کہا جیسے" برابری میں کیا جاتا ہے، وہ تو مجلس منتظمہ کا ایک اہم ممبر تھا اس لئے اسے 'السلام علیکم' نہیں بلکہ سلام کرنے کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہئے تھا، لیکن کون سا ــــ ؟

یہ تو وہ خود نہیں جانتا تھا، اسے جاننے کی ضرورت بھی کیا؟ وہ تو موذن کے ماتحت نہیں تھا، موذن اس کے ماتحت تھا اس لئے اسے یہ چیز جاننی چاہئے تھی۔

اس نے سر کے ایک ہلکے سے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ موذن گھبرا کر قدرے پیچھے ہٹ گیا۔ امام صاحب مصلے پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔

مسجد کے نمازی سلام پھیر کے اس کی طرف پر امید نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ شاید پچھلی منتظمہ نے انہیں کافی مایوس کیا تھا۔ مسجد میں جگہ جگہ جالے پڑے تھے۔ کونے کھدروں میں گرد و غبار جمع ہو گئے تھے، چٹائی کے تنکے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے، حوض میں کائی جمع تھی اور اوپر پانی کا رنگ سبز مائل ہو رہا تھا۔ وضو کے لوٹے بد وضع ہو گئے تھے، ان پر برسوں سے پالش نہیں ہوئی تھی۔ ہال اور صحن کے کئی بلب فیوز کر چکے تھے اور بجلی کے دو تین پنکھے تو چلنے ہی سے معذور تھے۔

یہ سب تو وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اب اس نے مزید جانا کہ یہاں اور بھی بہت سے کام ہیں جو ابھی فوراً نگاہوں کی پکڑ میں نہیں آئے، یعنی نئی منتظمہ کو نئے سرے سے

اپنی ترجیحات طے کرنی ہوں گی۔

بات ایک خاص جگہ پر آ کر رک گئی۔ نہ مجرم کی نشاندہی ہو سکی نہ آلۂ واردات برآمد ہوا، تو ایک حد تک انتظار کرنے کے بعد بڑے آدمی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

فیصلہ......!!

یہی کہ یہ معاملہ اب خارج کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی دم نہیں اور جن لوگوں نے یہ معاملہ اٹھایا تھا انہوں نے دوسروں کے قیمتی اوقات ضائع کیے۔ اس لئے ان سے جواب طلب کیا جائے۔

جواب طلبی کا خط بھی آ پہنچا۔

خط کا آنا تھا کہ ایک ہلچل سی مچ گئی۔ لوگ اپنی اپنی جگہ بے چین ہو اٹھے، لیکن بے چینی کے اظہار کا فی الحال ان کے پاس کوئی وسیلہ نہیں تھا، ان کے پاس کوئی ایسا پلیٹ فارم بھی نہیں تھا جہاں سب لوگ اکٹھے ہو سکیں۔ ابھی تک ان کی جو بھی سرگرمی رہی تھی، وہ ٹولیوں میں منقسم تھی۔ اس میں جو ٹولی قدرے بڑی ہوتی تھی، وہ دوسری ٹولیوں پر حاوی ہو جاتی تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ زیادہ تر ٹولی بے حس و حرکت تھی، اس لئے جو ٹولی حرکت میں ہوتی تھی وہ اس تاثر کا حقدار بن جاتی تھی کہ سبھی اس سے متفق ہیں، یوں کبھی کبھی حالات ایسے پیدا ہو جاتے تھے کہ ایک ایسے پلیٹ فارم کی واقعی ضرورت پڑ جاتی تھی جہاں صحیح معنوں میں لوگ جمع ہوں۔ مگر یہ چیز میسر نہیں تھی۔

جو ٹولی شروع سے سرگرم عمل تھی، اب تو اسے ہی جذبات کے اظہار کی ذمہ داری نبھانی تھی اور حسب روایت یہ تاثر دینا تھا کہ دوسرے بے حس و حرکت لوگ ان سے متفق ہیں۔

''یہ تو ہماری بہت بڑی شکست ہے......''

بہت دھیمے انداز میں اظہار کا سلسلہ شروع ہوا۔

''لیکن اس کا اندازہ تو شروع ہی سے تھا......''

وہاں کچھ حقیقت پسند بھی تھے، حالانکہ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اس لئے ان کی آواز بھی خاصی دھیمی رہتی۔

''مطلب......؟''

آواز خاصی اونچی تھی۔ اس میں برہمی کا عنصر نمایاں تھا۔

''مطلب یہ کہ جب یہ معاملہ دوسری طرف جانا تھا، تو بہت سوچ سمجھ لینا چاہئے تھا۔ اب اس صورت حال میں ہم کس کو اپنا منہ دکھائیں......''

تھوڑی دیر تک ایک اضطراب آمیز سکوت طاری رہا، پھر ایک تیز آواز ابھری۔

''ہم نے تو اپنا احتجاج درج کر دیا تھا، انہوں نے بال ہمارے آنگن میں پھینک دی یعنی بہت خوبصورتی اور خاموشی سے ہمیں شکست دے دی۔''

''بھائی، جب کبھی ایسی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو توجیہات کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ سب آپس میں گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ ایسے میں صحیح بات کو اندر سے کھینچ کر باہر نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے......''

یہ ایک ایسی آواز تھی جو الفاظ کے کھٹولے پر اڑتی ہوئی نہ آتی تو سب اسے ضمیر کی آواز سمجھنے پر مجبور ہوتے۔ لوگوں نے اسے کڑوی نگاہوں سے گھورا۔

''دیکھئے، ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ دوسروں کی شکایت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ کی بڑی سے بڑی شکایت بھی صرف آپ ہی تک محدود رہ جائے گی، وہاں تک ہرگز نہیں پہنچے گی، اس وقت ہم صدق دل سے اپنا محاسبہ کرلیں تو یہ چیز ہمیں آئندہ بہت کام آئے گی......''

کچھ آوازیں ایسی ہوتی ہیں جن کا سُر دھیما ہوتا ہے لیکن ان کا اثر دور دور تک محسوس ہوتا

ہے، وہ بھی فوری نہیں، آہستہ......آہستہ
مگر اس وقت کچھ تیز وتند آوازیں تھیں جو تعداد میں کم ہونے کے باوجود سب پر چھا رہی تھیں۔

''ہمیں ذلیل کیا گیا۔ ہم انصاف مانگنے گئے تھے، انہوں نے مجرم تلاش کرنے اور آلۂ جرم کو ڈھونڈنے کی ذمہ داری ہمیں ہی سونپ دی، جب ہم اتنا کر ہی سکتے تھے تو پھر سزا بھی خود ہی دے لیتے۔ ان کے پاس جانے کی ہمیں ضرورت کیا تھی۔ اصل میں انہوں نے ہماری شرافت کو ہماری کمزوری سمجھ لیا۔ انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ ہم اپنے ہاتھوں ذلیل ہو گئے......''

آواز میں تلخی پھر تندی پیدا ہوتی گئی۔ اس کے اثر سے جو ایک باریک سیاہ جھلی پیدا ہوئی اس نے سب کے سر پر اپنا سایہ کر لیا۔ اس باریک جھلی کو ہلکے سے چاک کرنے کی بھی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ مہیب سناٹا دیر تک چھایا رہا۔ ایسے میں جو ایک دھیمی آواز نکلی، وہ جھلی کو چاک تو خیر کیا کرتی، اس نے اسے اور مضبوطی عطا کر دی۔

''پھر.........؟''

''پھر یہ کہ آئندہ اپنے آپ پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ کسی چھوٹے یا بڑے آدمی پر نہیں۔ اس بڑے آدمی نے جس طرح ہمیں جھوٹا کر دکھایا، اس کا کوئی جواب ہے ہمارے پاس......''

معاملے نے اب کئی رخ اختیار کر لیا تھا اور یہ سبھی کسی نہ کسی طرح ایک ہی شیطان پر کنکریاں پھینک رہے تھے۔ ایسے میں جن لوگوں کے ذہن دودھ اور پانی کو آپس میں گھل مل جانے کے بعد بھی الگ الگ دیکھتے تھے، ان کے لئے فی الحال چپ رہنے یا بہت آہستگی سے اپنی بات، وہ بھی بالکل عام انداز میں رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ یوں آہستگی سے اپنی بات رکھنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا کیوں کہ جن لوگوں نے ایسا کیا، انہیں پھر خاموش بھی ہو جانا پڑا۔ دراصل اس وقت بات عقل وخرد سے زیادہ غم وغصہ

کی ہوگئی تھی۔ اس کی مخالفت میں جو سر اٹھتے، ان کی خیر نہیں تھی۔ ویسے ان کے دل میں اس وقت بہت سی باتیں جنم لے رہی تھیں۔ ان کا بروقت اظہار ہو جاتا اور سکون کے ساتھ سن لی جاتیں اور کچھ باتوں پر عمل بھی ہو جاتا تو شاید حالات کچھ سدھر سکتے تھے۔

وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بہت سارے ڈرامے جو نظروں کے سامنے تھے، ان میں اداکاروں کا کوئی خاص رول نہیں تھا۔ اصل رول ان خفیہ اور دکھائی نہ دینے والے مہین تاروں کا تھا جو ان کے جسم کے مختلف حصوں سے بندھے ہوتے اور اس سے زیادہ رول ان انگلیوں کا ہوتا جو دبیز پردوں میں رہ کر انہیں نچاتی تھیں، یعنی انگلیوں نے تاروں کو جنبش دی جو اداکاروں کے پاؤں سے بندھی ہوتیں، پاؤں تھرکنے لگتے، اس تھرکن پر جو تالیاں بجتیں، وہ صرف اداکار کے لئے نہ کہ ان طاقتور انگلیوں کے لئے۔ اسی طرح انگلیوں نے ان تاروں کو جنبش دیا ہوتا جو گردن سے بندھی ہوتیں تو گردن اثبات یا نفی میں جھولنے لگتی۔

وہ جتنا پردے میں تھا، اتنا ہی خوفناک تھا۔ اس کے بارے میں طرح طرح کے تصورات لوگوں کے ذہن میں تھے، کبھی کبھی یہ تصورات مٹ بھی جاتے اور ان کی جگہ دوسری شکلیں آجاتیں۔ ایسا جب بھی ہوتا، اس کی خوفناکی میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ یہ کام جان بوجھ کر نہیں بلکہ لاشعوری طور پر ان کے ذہنوں میں اس کی خوفناک سے خوفناک ترین شکلیں بنتی رہتیں۔ یوں ان کے ذہنوں میں ان شکلوں کی تصورکاری کا ایک خاموش مقابلہ چلتا رہتا اور کمال یہ کہ کسی کو کسی دوسرے کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ ان کے اپنے ذہن ہی میدان کارزار تھے۔

یہ ایک عجیب صورت حال تھی جس سے صحیح معنوں میں جو لوگ واقف تھے، وہ سخت پریشانی اور تردد میں تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتے لیکن نہیں کہہ سکتے تھے، جو کچھ کہتے، اسے کوئی سنتا نہیں تھا، ایک قلیل تعداد سنتی تھی، وہ سمجھتی نہیں تھی۔ ویسے ان کی آواز اتنی

دھیمی ہوتی کہ سبھوں تک پہنچتی بھی نہیں تھی۔ ایسے لوگوں کی نگاہوں کے سامنے، جو کچھ ہونے والا تھا، اس کا ایک دھندلا سا نقشہ موجود ہوتا۔ وہ چاہتے تھے کہ دوسرے بھی کسی طرح اس نقشے کو دیکھ لیں، اس میں وہ بری طرح ناکام رہے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ آنکھیں صرف انہیں کے پاس تھیں، دوسروں کے پاس نہیں تھیں۔ وہ اپنی آنکھیں دوسروں میں جڑ نہیں سکتے تھے، زیادہ سے زیادہ وہ اپنی آنکھوں سے انہیں یہ نقشہ دکھا سکتے تھے لیکن دیکھنے والے کہاں تھے —؟

اسے بالکل پتہ نہیں چلا کہ وہ کب، کس خاموشی اور آہستگی کے ساتھ بہت حد تک اسی دھارا میں شامل ہو گیا تھا جس کی گنگا بہہ رہی تھی۔ اس میں یقیناً ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اس بہاؤ میں شامل نہیں تھے یا شامل نہیں ہونا چاہتے تھے، لیکن چونکہ ان کی تعداد بہت قلیل تھی اس لئے وہ شامل نہیں ہونے کے باوجود شامل دکھائی دیتے تھے، یعنی دھارا سے الگ ان کے عمل اور سوچ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

اس نے بھی اس سلسلے میں کوئی باقاعدہ فیصلہ نہیں کیا تھا لیکن وہ بہاؤ کے ساتھ بہتا ہوا نظر آرہا تھا تو اب اس کے پاس بھی انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے فی الحال اپنے آپ کو اسی دائرے میں محدود کر رکھا تھا جس کے اندر ایک چھوٹی سی ذمہ داری اسے سونپی گئی تھی، مگر یہ اسے بالکل خبر نہیں تھی کہ دائرے پھیلتے بھی ہیں، سکڑتے بھی ہیں۔ پھیلتے ہیں تو بہت دور تک جاتے ہیں اور ایک کے بعد ایک دائرے بنتے جاتے ہیں۔ یوں ان کی چوڑیاں سی بنتی جاتی ہیں۔ لیکن جب یہی دائرے ٹوٹتے ہیں تو پھر انہیں کوئی روک بھی نہیں سکتا، وہ فنا کے گھاٹ اتر کر فنا ہو جاتے ہیں۔

روزی روٹی کی مصروفیت کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی کام تو تھا نہیں۔ اس نے جب پابندیٔ اوقات کے ساتھ ساری نمازیں مسجد میں ادا کرنے کی ٹھان لی تو اسے

محسوس ہوا کہ اب تک وہ اپنا بہت سارا وقت ضائع کرتا رہا۔ برباد وقتوں کا اس کے پاس کوئی حساب بھی نہیں تھا۔ آگے وہ چھٹی کا اکثر سارا سارا دن مسجد میں گزارنے لگا۔ انتظامیہ، وقت بے وقت میٹنگ کرنے، رمضان کے رمضان مسجد میں سفیدی پھروانے اور جمعہ کے جمعہ صفوں میں ٹوپی ہاتھوں میں لے کر چندہ منگوانے کے علاوہ اور کوئی خاص کام انجام نہیں دیتی تھی۔ ان کے تقریباً سبھی فرائض امام اور مؤذن انجام دیتے تھے، جو ان کے تنخواہ دار تھے اور جنہیں وہ اپنا نوکر تصور کرتے تھے۔

اسے خیال آیا کہ جب یہ نوکر ہیں تو پھر انہیں نوکر ہی کی طرح رہنا چاہئے۔ امام صاحب کا اسٹائل یہ تھا کہ اسے دیکھتے تو بہ آواز بلند السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، کہتے، پھر دونوں ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھاتے۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ اسے اپنی برابری کا نہیں بلکہ اس سے کچھ کمتر ہی سمجھتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں وہ ان کے ہر سلام اور ہر مصافحے پر خفت سی محسوس کرتا۔ حالانکہ امام صاحب اس کے ساتھ کوئی خصوصی برتاؤ نہیں کرتے تھے، وہ سب کے ساتھ اسی انداز سے پیش آتے، ان کے سلوک سے یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ اسے دوسروں سے کچھ زیادہ اہمیت دیتے ہیں، حالانکہ وہ مجلس منتظمہ کا ممبر تھا۔ البتہ مؤذن اس کے سامنے زیادہ مؤدب رہتا، وہ اسے دور سے سلام کرتا، پھر نزدیک آکر پورا سلام کرتا، مصافحہ کے لئے کبھی بیتابی سے ہاتھ بڑھانے کی کوشش نہیں کرتا، کبھی ہاتھ بڑھاتا ضرور، مگر اس سلسلے میں وہ کوئی باقاعدہ عمل نہیں کرتا، پھر بھی اسے یہ تشفی ضرور رہتی کہ وہ اس پر خصوصی توجہ دیتا ہے۔ وہ کبھی اپنی چپل لاپروائی سے باہر چھوڑ دیتا تو وہ اسے اٹھا کر مخصوص طاق پر رکھ دیتا، وضو کرتے وقت اس کا چشمہ اور گھڑی محفوظ مقام پر رکھ دیتا، خواہ مخواہ اس کے آس پاس موجود رہنے کی کوشش کرتا۔ ان باتوں کے باوجود اسے محسوس ہوا کہ مؤذن کی مسجد کے علاوہ بھی مصروفیات ہیں، کیوں کہ جائے نمازوں پر گرد کی تہہ پڑی ہوتیں، کونے وغیرہ میں ہلکے پھلکے کوڑے دکھائی دے جاتے، کہیں کہیں

جائے نماز بے ترتیب بچھی ہوتی۔ کبھی وہ نماز کے اوقات کے علاوہ مسجد میں جا پہنچتا تو مؤذن کو غائب پاتا، عام طور پر وہ اذان سے کچھ قبل آتا اور نماز کے بعد پھر غائب ہو جاتا۔ جب کئی بار اس نے یہی دیکھا تو امام صاحب سے دریافت کیا۔ وہ مسجد ہی کے ایک کمرے میں رہتے تھے اور کئی شفٹوں میں محلے کے بچوں کو قرآن پاک، اردو اور دینی کتابیں پڑھاتے۔ امام صاحب کی نگاہوں میں تعجب کی لہریں موجزن ہوئیں، وہ ایک خاص انداز میں مسکرائے، جسے وہ کوئی معنی نہیں پہنا سکا۔

''بھائی، آپ لوگ اس بچارے کو تنخواہ ہی کیا دیتے ہیں، اس میں کس طرح کسی کا گزارا ہوسکتا ہے بھلا ــــ؟''

''لیکن امام صاحب، آسامی قبول کرتے وقت تو یہ ان پر اچھی طرح واضح تھا کہ انہیں یہی تنخواہ ملے گی......؟''

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ مؤذن کی بحالی کے وقت وہ منتظمہ کا ممبر نہیں تھا، اب تھا تو اسے بات تو اسی حیثیت سے کرنی تھی۔

امام صاحب پھر مسکرائے۔ یہ مسکراہٹ پہلے سے بالکل مختلف تھی۔ یہ اور بات کہ وہ اسے بھی کوئی معنی پہنانے سے معذور رہا۔

''وہ تو صحیح ہے، لیکن وہ بچارہ فاضل اوقات میں کچھ کام کر لیتا ہے۔ مسجد کے اوقات مقررہ میں بے ایمانی نہیں کرتا۔ آخر کوئی اتنے کم پیسوں میں زندگی کیسے گزار سکتا ہے بھلا ــــ؟''

امام صاحب کی منطق اس کی سمجھ میں آئی نہ پسند آئی۔

اس نے قدرے ترش روئی سے کہا۔

''لیکن امام صاحب، مسجد میں صرف اذان دینا ہی تو کام نہیں ہوتا، اس کی صفائی، اس کی خدمت بھی تو ضروری ہے۔ مؤذن کو تو کل وقتی ہونا چاہئے......''

اس درمیان مؤذن بھی وہاں آ کھڑا ہوا تھا مگر وہ چپ ہی رہا بلکہ اس نے اپنی نگاہیں بھی نیچی کر لیں۔ کچھ اور لوگ بھی وہاں آ گئے۔ کچھ مؤذن کی حمایت میں بولنے لگے، کچھ مخالفت میں، اگر چہ سب کی آوازیں دھیمی تھیں۔

''تو پھر آپ اس کی تنخوہ اتنا بڑھا دیجئے کہ اسے کسی دوسرے کام کی ضرورت نہ پڑے......''

امام صاحب اب بھی مسکرا رہے تھے۔ یہ مسکراہٹ پہلی دونوں مسکراہٹوں سے مختلف تھی، وہ مسکراہٹوں کے مکالمے کا ماہر ہوتا تو کتنی آسانی سے ان کی تہہ تک پہنچ جاتا۔

''لیکن امام صاحب، ہم مؤذن کی تنخواہ بڑھا بھی دیں، پھر بھی آپ سے زیادہ تنخواہ تو نہیں دے سکتے نا، اور یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ آپ اپنی کمی بچوں کو پڑھا کر پوری کر لیتے ہیں ــــ''

اس نے ایک معقول جواب دینے کی کوشش کی۔ امام صاحب کے چہرے پر مختلف قسم کی مسکراہٹوں کے سائے اچانک غائب ہو گئے۔ انہوں نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

''آپ جو کچھ جاننا چاہتے ہیں وہ تو آپ کے جواب ہی میں مضمر ہے۔ اب آپ خود فیصلہ کریں کہ کیا ہونا چاہئے۔''

یہ صحیح تھا کہ مؤذن نے اپنی گزر بسر کے لئے چائے کی ایک چھوٹی سی دکان کھول رکھی تھی۔ اس میں صرف نمازی ہی نہیں آتے تھے بلکہ راہ گیر اور محلے میں رہنے والے کچھ اور لوگ بھی آتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ دور دور تک چائے کی کوئی دکان نہیں تھی۔ اس دکان میں شکر پارہ، بسکٹ اور کلچے بھی رہتے۔ اردو اخبار کے ساتھ ایک ہندی اخبار بھی آتا، جسے پڑھنے والے نام نہاد اردو داں ہی تھے۔ رات تک اخباروں کی شکلیں یوں ہو جاتیں کہ پھر وہ ردی کے مول بھی بکنے کے لائق نہیں رہ جاتے تھے، مگر اس چھوٹے سے

نقصان سے مؤذن کو فائدہ زیادہ ہوتا تھا۔ اخباروں کی چھوٹی سی لالچ میں چائے زیادہ بک جاتی، ساتھ ہی نمکین اور میٹھے بھی۔

مؤذن نے باقاعدگی سے آنے والے ایک گاہک کو سرگوشیوں میں، مسجد میں ہونے والی ساری باتیں بتادی تھیں جو چائے خوری کے سبب اس کا دوست بن گیا تھا۔ پتہ نہیں سرگوشی میں کون سی طاقت پوشیدہ تھی کہ ساری باتیں سب لوگوں کے کان میں پہنچ گئیں اور مسجد کے گوشے میں ہوئی ایک لاحاصل سی گفتگو موضوع گفتگو بن گئی۔ ظاہر ہے کہ بات جب آگے بڑھتی ہے تو بہت سے دروازے کھل جاتے ہیں، ایک ایک بات سے کئی کئی روشنیاں پھوٹتی ہیں۔

''بھائی، یہ آدمی تو بہت دبا دبا سا تھا، کٹا کٹا سا، حاشیے پر چلتا تھا، اس نے تو بڑے پرزے نکالے......''

''وہ مجلس منتظمہ کا ممبر بنا دیا گیا ہے نا، اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگا ہے......''

''اس میں ایسا کون گن تھا بھائی کہ وہ مجلس منتظمہ کا ممبر بنا دیا گیا — ؟''

''وہ پانچوں وقت مسجد میں پہنچنے کی کوشش کرتا تھا، سوچا گیا ہوگا کہ اس کام کے لئے وہ مناسب ترین شخص ہوسکتا ہے......''

''اس نے ثابت تو کر ہی دیا۔ اسے تو اب سکریٹری یا صدر بنا دینا چاہئے......''

''مگر یار، یہ لوگ بھی عجیب ہیں۔ ایک چھوٹا سا، غیر اہم عہدہ کیا ملا کہ اس کا دماغ خراب ہوگیا۔ بڑے عہدے ملنے پر تو بالکل پاگل ہی ہوجائے گا......''

''کمال ہے یار کہ ایک بیحد معمولی، حاشیائی آدمی، غریب گھر میں جنما، غربت میں نشو ونما ہوئی، اک ذرا موقع ملا اور اس نے ثابت کر دیا کہ......طویل وقفہ......''

''آخر کیا ثابت کیا اس نے — ؟''

''بس یہی کہ حکومت کرنے کا مادہ اس کے خون میں شامل ہے۔ سینکڑوں برس سے

مار کھاتے کھاتے بھی یہ جراثیم اس کے خون سے نہیں گئے، کہیں نہ کہیں، کسی طرح باقی رہ گئے، لوگوں نے سمجھا کہ اب گئے لیکن......''

''اس کا مطلب ہے اگر اسے واقعی کوئی پاور مل گیا تو وہ وبال کر دے گا۔''

''ہوائی پاور میں تو یہ رنگ ڈھنگ ہیں، حقیقی پاور میں تو......''

''بات یہ ہے کہ ان سب کے خون میں یہ چیز شامل ہے۔ ان کی تاریخ سینکڑوں برس حاکم ہونے کی بات بتاتی ہے، ان کی نفسیات بن گئی ہے کہ وہ محکوم بن کر نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر اس جگہ بے چین سے رہتے ہیں جہاں انہیں محکوم بن کر رہنا پڑتا ہے۔ یہاں بھی سمجھو کہ بس وہ موقع کی تلاش میں ہیں......''

''اور ہمارے لوگ اپنی معصومیت میں ان کی یہ نفسیات سمجھ نہیں پاتے اور ان کی خاموش سازش میں انجانے پن میں شریک ہو جاتے ہیں۔ دیکھ لینا ایک دن یہ ستاّ پر قبضہ کریں گے، پھر دیکھنا ان کا ننگا ناچ......''

''یاد ہے کتنی چھوٹی اور بے معنی سی ایک بات کو انہوں نے ایشو بنایا تھا، مہینوں ان کے ہاں سر جوڑ کر باتیں ہوتی رہیں، یہاں تک کہ ہم لوگوں تک بھی یہ بات پہنچ ہی گئی، وہ بھی مطالبے کی صورت کہ ہم قصوروار کو پکڑیں اور اسے سزا دیں۔ ارے بھائی، کون قصوروار کیسی سزا۔ جب ہوشیاری سے یہ بال انہیں کے آنگن میں پھینک دی گئی تو ٹائیں ٹائیں فش......''

''سیکولرزم، جمہوریت، آئین، قانون سازی......وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے اپنی پناہ گاہیں ڈھونڈ رکھی ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر ستا حاصل کر لیں......''

''اور سنو، خود تو یہ لوگ زبردست مذہبی ہیں۔ اپنے مذہب میں رتی برابر آگے پیچھے برداشت نہیں کر سکتے۔ ساڑھے چودہ سو برسوں سے بالکل اوریجنل مذہب کو اپنے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں مگر سیکولرزم کی دہائی دیتے نہیں تھکتے......سیکولرزم یعنی لامذہبیت،

لیکن انہیں اپنی لامذہبیت منظور نہیں، اسٹیٹ کی لامذہبیت سو جان سے قبول ہے......''

''ایک غریب، بے سہارا مؤذن بھی ان کے راج میں اپنی مرضی سے اپنی روزی روٹی پیدا نہیں کر سکتا، رہنا ہے تو غلام بن کے رہو، ورنہ جہنم میں جاؤ......''

''جب دنیا میں ان کے لئے کرنے کو کچھ بھی نہیں رہا تو انہوں نے اپنے خدا کے گھر ہی کو اپنی ستا کے جھگڑے کا گھر بنالیا۔ مسجد تو عبادت کی جگہ ہے لیکن ان کے آپسی من مٹاؤ کے اظہار کی جگہ بن گئی......''

''دیکھتے نہیں، مسلکوں کو لے کر ان کے یہاں اس قدر آپسی لڑائی ہے کہ ایک مسلک والے، دوسرے مسلک کے ماننے والوں کو مسجدوں میں گھس کر بے دریغ قتل کر ڈالتے ہیں......''

''انہیں اپنے سگوں کو مارنے میں ہچک نہیں ہوتی تو بھلا یہ دوسروں پر کیا رحم کریں گے......''

''ابھی دیکھتے جاؤ، مسجد میں شروع ہونے والا جھگڑا کیا رنگ لاتا ہے۔''

''وہ سب اپنی جگہ ہے لیکن، ہم اس وقت کیا کر رہے ہیں — ؟''

''مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ ان کا کوئی جھگڑا ہو، کوئی معاملہ ہو، ان کی تان ہم ہی پر ٹوٹتی ہے......''

''ارے بھائی، یہ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے — ہم اکثریت میں......''

''یہی تو بھول ہے ہم سب کی۔ ہم انہیں اقلیت کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں۔ یہ یہاں اقلیت میں ہیں نا، لیکن پوری دنیا میں تو پھیلے ہوئے ہیں اور ان کا آپس میں گہرا تعلق بھی ہے۔ گنتی کرو تو یہ بہت بڑی اکثریت ہیں۔ ان کا مذہب ایک، ان کی سوچ ایک، ان کی منزل ایک، ہم تو ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں......''

''اس طرح سوچیں گے تو ہمیں کبھی چین نصیب نہیں ہوگا۔ تم جو کچھ کر رہے ہو، اگر واقعی ایسا ہوتا تو وہ اس وقت دنیا کی بہت بڑی طاقت ہوتے لیکن یہ تو اس طرح بٹے ہوئے

ہیں کہ کروڑوں میں ہوتے ہوئے بھی ان کی کوئی حیثیت نہیں......''

''بھائی، تم تو انہیں کی زبان بول رہے ہو۔ تم نے ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھا، ان کے سماج کا ایک بہت ہی معمولی، سب سے نچلی صف کا آدمی جسے وہ خود کیڑے مکوڑے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے، ایک چھوٹی سی مسجد کا ممبر بنا تو اس کے تیور کس طرح بدل گئے۔ اس نے سب سے پہلے اقتدار کا ڈنڈا اپنے ہی لوگوں کے سر دے مارا۔ اپنوں سے فارغ ہو کر ظاہر ہے کہ پھر اس کا نشانہ ہم ہی ہوں گے......''

''دیکھا جائے گا۔ ہم اتنے کمزور بھی نہیں کہ ان کے ڈر سے اپنی نیندیں حرام کر لیں......''

''نیندیں حرام نہ کریں، ہوشیار تو رہ ہی سکتے ہیں۔ افسوس تو اس کا ہے کہ ہم بالکل بے پروا ہو جاتے ہیں......''

''کس طرح کی ہوشیاری کریں بھائی، تم ہی بتاؤ......''

''ان کا بغور مطالعہ کرتے رہیں، ان کی تاریخ کو پڑھتے رہیں، اپنا جائزہ لیتے رہیں۔ پہلی نگاہ ان پر پڑے تو دوسری نگاہ فوراً اپنے آپ پر پڑنی چاہئے......''

''ہوں...... بات تو کچھ معقول لگ رہی ہے......''

یہ تمام باتیں کسی ایک مقام پر، ایک ہی وقت میں نہیں ہوئیں۔ مختلف اوقات میں، مختلف مقامات پر، مختلف لوگوں کے درمیان ہوئیں۔ ہواؤں سے کشید کر انہیں یکجا کیا گیا تو یہ باتیں ایک مربوط گفتگو بن گئیں۔

شہر کے ایک بااثر طبقے نے فیصلہ کیا کہ شہر کے بیچوں بیچ چوراہے پر بڑے آدمی کا ایک عظیم الشان بت نصب کیا جائے۔

اس فیصلے کے فوری طور پر دو اثرات مرتب ہوئے۔ جو لوگ بنیادی طور پر بت پرستی کے خلاف تھے، انہوں نے مخالفت کی، اس کی بھی دو وجہیں سامنے آئیں۔ ایک اصولی

دوسری مذہبی۔

دوسری مخالفت ان لوگوں نے کی جن کا کہنا تھا کہ کسی زندہ ہستی کا بت کیوں — ؟ان لوگوں کا کچھ ان لوگوں نے بھی ساتھ دیا جو اس طبقے کے بھی ساتھ تھے جس نے نہایت جوش کے عالم میں بت نصب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

لیکن اس قسم کی مخالفت یا موافقت صرف اکیڈمیک ہی ہوتی ہے۔

دنیا میں جو کچھ بھی اچھا برا ہوتا ہے، اس کی کچھ نہ کچھ مخالفت ضرور ہوتی ہے۔ اسی طرح موافقت بھی۔ مگر یہ چیزیں یا تو دلوں میں دم توڑ دیتی ہیں یا زبانوں پر مچلتی ہیں تو ان کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا، یا ڈرائنگ روم کے شیشوں کے اندر موہوم سائے کی طرح متحرک رہتی ہیں۔

بت نصب کرنے کا فیصلہ جتنا آسان تھا، اس پر عمل کرنا اتنا ہی مشکل، سب سے پہلے تو سیدھے سادے طریقے سے پیسہ ہی آنا مشکل تھا۔ فوری حل کے لئے لوگ سر جوڑ کر بیٹھے تو یہ مسئلہ سب سے آسان نظر آیا۔ پورے شہر ہی کے لوگ فرداً فرداً ایک چھوٹی...... بہت چھوٹی سی رقم نکال لیں تو پھر نہ سرکار سے مدد طلب کرنے کی حاجت نہ کسی اندرونی یا باہری ادارے کے سامنے ہاتھ پسارنے کی کراہیت، نہ کسی بہت بڑے آدمی کے سامنے گڑگڑانے کی ذلت۔ اس تجویز کو لوگوں نے پسند کیا۔ اسی وقت ایک چھوٹی سی رقم بھی طے کر لی گئی کہ بس یہی رقم لی جائے۔

جن لوگوں نے بت نصب کرنے کا فیصلہ کیا تھا انہوں نے اتنے کم کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا، وہ تو بہت خوش ہوئے، اصل مشکل ان لوگوں کے لئے ہوئی جو اصولی اور مذہبی طور پر اس کے مخالف تھے۔

رقم ان کے لئے بھی بہت نہیں تھی ......اصول اور مذہب۔

''یہ ہمارے مذہب پر صریحاً حملہ ہے......''

ایک بزرگ قدرے زور سے بولے۔

''حملہ تو نہیں، لیکن اصولی طور پر یہ غلط ہے کہ سب پیسے دیں......''

ایک آزاد منش نے قدرے دبی زبان سے کہا۔

''واہ، یہ بھی خوب کہی آپ نے۔ یہ بتائیے، آپ کے مذہب میں بت پرستی حرام ہے یا نہیں......؟''

ایک تیسرے نے جرح شروع کردی۔

''بالکل ہے......''

اس شخص نے جلدی سے تائید کی۔

''تو پھر بت نصب کرنے کے لئے پیسے دینا......کیا معنی......؟''

ان کا انداز جارحانہ برقرار رہا۔

''اس بت کی پوجا تو نہیں ہوگی نا......؟''

اس شخص نے دبی زبان سے دریافت کیا۔

''یقیناً ہوگی......آخر بت نصب ہی کیوں کیا جا رہا ہے......؟''

''لیکن وہ شخص تو ابھی زندہ ہے نا......یعنی جس کا......''

''آج زندہ ہے......کل کو مر جائے گا تو پوجا شروع ہو جائے گی۔''

''ارے بھائی، ہم کل کو کیوں دیکھیں، آج کو کیوں نہ دیکھیں۔ تم ذرا یہ سوچو کہ دینے سے انکار کر دینے کا نتیجہ کیا ہوگا — ؟''

''سوال یہ ہے کہ ہم اپنے دین کا حکم مانیں یا سماجی دباؤ کو تسلیم کریں — ؟''

''آپ درگا پوجا، سرسوتی پوجا وغیرہ میں چندہ نہیں دیتے کیا — ؟''

''وہ تو یہ لوگ زبردستی گاڑی گھوڑا روک کر وصول لیتے ہیں، ہم اپنی مرضی سے کہاں دیتے ہیں — ؟''

''دیتے ہیں نا — ؟ اب جیسے بھی دیں اور اچھی طرح جانتے ہوئے بھی کہ یہ پیسے پوجا میں کام آئیں گے......''

''اب ہماری غیر موجودگی میں ان پیسوں کا وہ کیا کرتے ہیں، ہمیں اس سے کیا مطلب — ؟''

''تو وہی فارمولہ آپ یہاں کیوں لاگو نہیں کرتے — ؟''

''آج وہ ایک بت نصب کرنے کے لئے پیسے مانگ رہے ہیں، کل مندر کی تعمیر کے لئے پیسے وصول کریں گے، پرسوں......اس طرح تو ہم بالکل انجانے پن میں ان کے مذہب کے دائرے میں داخل ہو جائیں گے، یوں کہ ہمیں پتہ بھی نہیں چلے گا......''

''ہم تو جانے انجانے میں بہت سی چیزیں انجام دیتے ہیں۔ ہم کچھ نہیں جانتے کہ کون سا عمل ہمارے دینی عقائد پر ضرب لگا رہا ہے اور کون سا ہمارے اصولی عقائد پر۔ اگر ہم چھوٹے چھوٹے نکتوں کو پکڑے رہے تو دنیا میں رہ ہی نہیں سکیں گے، یعنی اس دنیا میں......''

''تو کیا خیال ہے، ہمیں بت نصب کرنے کے لئے خود بھی چندہ دینا چاہئے اور لوگوں سے اپیل بھی کرنی چاہئے......؟''

''اس کے علاوہ دوسرا راستہ کون سا ہے......؟''

''دوسرا راستہ......؟ وہ تو بس یہی ہے کہ ہم چندہ نہ دیں......''

''اس کے نتیجے پر بھی غور کرلیں......''

''ابھی ہم نے دوسرا راستہ اختیار کہاں کیا ہے۔ ابھی تو دونوں راستے ہمارے سامنے کھلے ہوئے ہیں، ہم نے تو ابھی فیصلہ ہی نہیں کیا کہ کون سا راستہ......''

''بھائیو، یہ تمام باتیں دل کے بہلانے کی ہیں، دوسرے لفظوں میں وقت ضائع کرنے کی۔ ہم ہزار اپنے غم وغصہ کا اظہار کرلیں، آپس میں مل بیٹھ کر ہزار اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں، راستہ ہم وہی چننے پر مجبور ہیں جو سیدھا ہے۔ اس لئے ہماری مانئے تو یہ حجت

بند کیجئے اور......"

اس پر وہاں ایک ناراضگی سی پھیل گئی۔ جو لوگ اپنی اپنی سطح کی تعمیر کر کے، اپنے آپ کو ان پر نصب کر کے، اپنے ہاتھوں سے اپنے گلوں میں پھولوں کے ہار پہنانے میں مصروف تھے، انہیں محسوس ہوا کہ وہ اچانک اوپر سے نیچے آ گرے ہیں۔ ان کی تعمیر کردہ سطحیں برباد ہو گئیں، ان کے نصب کئے ہوئے بت ٹوٹ گئے، ان کے ہاتھ کی مالائیں چھن گئیں، ان کے پھول پتی پتی ہو کر بکھر گئے۔ ان میں سے ایک نے کسی طرح اپنے آپ کو نیچے سے اٹھایا اور زخمی لہجے میں بولا۔

"آپ نے ہمیں اس قدر ہلکا پھلکا کیوں سمجھ لیا کہ جس کے جی میں آئے، ہماری نکیل گھما دے۔ آخر ہم بھی یہاں کے شہری ہیں، ہماری بھی کچھ رائیں ہیں۔ ہم کوئی فیصلہ کر کے ہی کسی راستے کو چنیں گے نا، دوسروں کے کہنے پر تو نہیں چلیں گے......"

کچھ دیر کے لئے ایک پراسرار، اضطراب آمیز خاموشی چھا گئی۔ سب کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ اس آدمی نے اپنی گردن کے گرد لپٹے ہوئے مفلر کو از سرِ نو لپیٹا جس سے اس کی گردن اور چست اور درست ہو گئی، وہ دھیرے سے بولا۔

"میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی، صرف یہی تو کہا کہ جب ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم ہر حال میں کسی نتیجے پر پہنچیں گے تو پھر محض دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے وقت ضائع کرنے کا فائدہ......؟"

"آپ اسے وقت ضائع کرنا کہتے ہیں ـــــ؟ برادرم، دراصل یہ ساری قواعد کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے تمام امور پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ہے۔ ہمیں ہر کسی کے جذبات کا خیال رکھنا ہے نا، ہر کسی کو مطمئن رکھ کر متفقہ طور پر کسی ایک فیصلے پر پہنچنا ہے......"

جواب بہت سنجیدگی سے دیا گیا۔

"تو میں بھی آپ کی بات سے کہاں اختلاف کر رہا ہوں۔ بس یہی کہتا ہوں کہ یہ بات

معلوم ہے کہ نتیجہ......''

''اصل اختلاف تو یہیں پر ہے۔ یہ بات پہلے سے معلوم بھی ہے کہ ہم کسی خاص نتیجے پر پہنچیں گے، پھر بھی اس مسئلے پر سب کی رائے کا آجانا اور کسی ایک نکتے پر متفق ہو جانا ضروری ہے......''

''بھائی، آپ لوگ تو دوسری باتوں میں الجھ گئے۔ یہ بات تو رہ ہی جاتی ہے کہ ہم اس اجتماعی چندے کے مرتکب ہوں گے یا نہیں ـــ؟''

''اتنی باتوں کے سامنے آجانے سے بھی بات واضح نہیں ہوئی کیا ـــ؟''

''یعنی ـــ؟''

''یعنی یہ کہ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں......''

پیسے اتنے آگئے کہ ان کی گنتی مشکل ہوگئی۔ ان لوگوں کو اس کامیابی کی بالکل توقع نہیں تھی۔ شاید بچے بچے نے دل کھول کر اس کارِ خیر میں حصہ لیا تھا۔ شروع میں بت نصب کرنے کی جو منصوبہ بندی کی گئی تھی وہ پھیکی پڑگئی اور نئے سرے سے، بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی کی ضرورت پڑگئی۔ اب کہ جو تیاری کمیٹی بیٹھی، اس نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ بت بنانے کا کام مقامی فنکاروں کو نہیں، بلکہ بڑے شہر کے کسی ممتاز فنکار کو دیا جائے۔ اس کے لئے الگ سے ایک چھوٹی کمیٹی کی تشکیل کی گئی جو دوسرے شہروں میں گھوم کر جینوئن اور بڑے فنکاروں کا پتہ لگائے اور ان کے نمونے منگوائے۔

اس فیصلے پر فوراً عمل کیا گیا۔

کمیٹی کے ممبران بڑے فنکاروں کی تلاش میں نکل پڑے۔ بہت چھان بین کے بعد تین فنکاروں کے نام طے کئے گئے۔ ان میں جو سب سے مہنگا فنکار تھا، اسے بت بنانے کا کام سونپا گیا۔ فنکار ان کی باتوں سے سمجھ گیا کہ انہیں اچھا سے اچھا کام درکار ہے، پیسہ

کوئی مسئلہ نہیں۔ چنانچہ اس نے اعلیٰ سے اعلیٰ میٹریل کا استعمال کیا اور باریک سے باریک ترین فنکاری اس میں لگادی۔ بجٹ یقیناً بڑھ گیا مگر فنکار جانتا تھا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ کام اچھا ہوگا تو دام ضرور منہ مانگا ملے گا اور ہوا بھی یہی۔ بت کیا تھا فنکاری کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ اسے نہایت اہتمام کے ساتھ لایا گیا اور سر سے پیر تک ریشمی قبا میں لپیٹ کر رکھا گیا۔ جن لوگوں نے دیکھا، وہ عش عش کر اٹھے۔ یوں اس کمیٹی میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جن کا آرٹ وغیرہ سے دور دور کا واسطہ نہیں تھا۔ وہ فنون لطیفہ کے الف ب سے بھی واقف نہیں تھے۔ مگر اچھی چیز دل میں نہ اترے، روح کو تازہ نہ کرے، آنکھوں میں چمک تو پیدا کر ہی دیتی ہے اور یہ بت تو اتنا چمک رہا تھا کہ اسے نقاب میں نہ رکھا جاتا تو آس پاس کے اندھیرے یقیناً بھاگ جاتے۔ ضروری نہیں کہ بھاگتے ہوئے اندھیروں کو آنکھیں بھی دیکھیں۔ کچھ چیزیں محسوس کرنے کی بھی ہوتی ہیں۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ اسے نصب کیسے کیا جائے اور اس کی نقاب کشائی کس طرح ہو۔ شہر کے بیچوں بیچ جو چوراہا تھا، وہ بہت گنجان اور گندہ تھا۔ چاروں طرف دکانوں کی یلغار تھی اور پرانے بوسیدہ زنگ خوردہ مکانات۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ جو کہیں کچھ گنجائش تھی تو فٹ پاتھ پر کپڑے، پھل، سبزی، انڈے، پاپڑ بیچنے والوں کے خوانچے لگے تھے۔ یہاں اکثر ٹریفک کا اژدہام رہتا۔ گاڑیاں بہت مشکل سے پار ہوتیں۔ بڑی گاڑیاں تو کبھی کبھی گھنٹوں کھڑی رہتیں یا پھر چیونٹی کی چال سے کھسکتی رہتیں۔ یہاں بت اسی وقت نصب ہوسکتا تھا جب یہاں کے پرانے مکانات اور دکانیں ڈھادی جاتیں۔ خوانچے والوں کو بھگا دیا جاتا اور پورے علاقے کو ایک نیا روپ دیا جاتا۔ کام بہت مشکل تھا لیکن بڑے آدمی کے نام میں اتنی طاقت تھی کہ بہت سے کام تو صرف اس کے نام ہی پر پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتے۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس مشکل کام کا بیڑا اٹھایا، انہوں نے اس کے نام کا تعویز بھی بہ حفاظت اپنے گلے میں ڈال لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدم قدم پر ان کی

مشکلیں آسان ہوتی گئیں۔کارپوریشن نے سارے منصوبے کو خوشی خوشی منظوری دے دی، سرکار نے بہت آسانی سے اپنے قوانین میں ضروری ترمیم کر دی۔ سارے متعلق افراد بہ رضا و رغبت اپنے نقصانات برداشت کرنے کو تیار ہو گئے۔

مہینوں کی لگا تار مشقت و محنت اور دل جمعی سے کام کرنے کی رغبت نے وہ دن دکھائے کہ چوراہے کی نہ صرف شکل و صورت بدل گئی بلکہ اس کی قسمت بھی۔اب اس شہر کی کوئی نشانی تسلیم کی جا سکتی تھی تو وہ صرف یہی چوراہا تھا۔چاروں طرف کشادہ سڑکیں، بیچوں بیچ نہایت خوبصورت پارک، رنگین پھواروں اور پھولوں سے مزین۔ وہاں اعلیٰ قسم کی گھاس لگا دی گئی تھی۔مکمل ہوتے ہوتے سرسبز اور شاداب گھاس اگ آئی تھی۔ پارک کے مرکزی مقام پر کافی اونچائی پر بت نصب کرنے کی جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔اس طرح اب وہاں بس ایک بت ہی کی کمی تھی۔

کمیٹی نے طے کیا کہ سارے کام توقع سے بڑھ کر انجام پا گئے تو بت نصب کرنے کی تقریب بھی ایسی یادگار ہو جسے شہر کیا، آس پاس کے علاقوں یہاں تک کہ پوری ریاست کے لوگ بھلا نہ سکیں۔اس کے لئے ضروری تھا کہ افتتاحی تقریب کا مہمان خصوصی ملک کی ایک اہم ترین شخصیت ہو۔مجوزہ اہم شخصیت سے رابطہ قائم کرنے کے لئے بھی ایک چھوٹی سی اعلیٰ سطحی کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ بڑے آدمی کے نام میں ایسا منتر تھا کہ اہم ترین شخصیت نے اپنی رضا مندی دے دی۔ پروگرام طے ہو جانے کے بعد پارک کو چاروں طرف سے قنات سے گھیر دیا گیا اور دنیا کی پر تجسس نگاہوں سے دور رکھتے ہوئے بت کو نصب کر کے اس پر ایک سیاہ موٹا پردہ ڈال دیا گیا۔اہم ترین شخصیت کی آمد کے موقع پر قنات ہٹا دئے گئے اور ایک شاندار تقریب کے ذریعہ اس کی نقاب کشائی کی رسم انجام دی گئی۔

ساری چیزیں منشا کے مطابق اور امید سے بڑھ کر خوبصورتی سے انجام پا گئیں

تو ایک اہم سوال یہ آن کھڑا ہوا کہ اس بت کا مصرف کیا ہو۔

اگر کسی آنجہانی کا بت ہوتا تو باہر سے آنے والے سرکاری مہمانوں کے لئے یہاں حاضری اور بت کے قدموں پر پھول چڑھانا ضروری قرار دیا جا سکتا تھا۔ اس بت کے ساتھ کسی مردے جیسا سلوک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہت سوچ، فکر اور سر جوڑ کر بیٹھنے سے کوئی حل نہیں نکلا تو اس مسئلے کو فی الحال یونہی چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اس کا خطرہ تھا کہ جو لوگ یہاں سیر سپاٹے کے لئے آئیں گے، کہیں وہ اپنی لاعلمی میں اس بت پر پھول نہ چڑھا دیں۔ زندہ کے بت پر پھول چڑھانے سے بدشگونی ہوتی ہے، اس لئے باقاعدہ پہریدار مقرر کر دیے گئے۔

لیکن ہونی کو کسی نے نہیں روکا یا پھر بدشگونی......

رات کی تاریکی اور تنہائی میں کسی نے بت کو نقصان پہنچا دیا۔ ناک تو بالکل ہی کاٹ کر پھینک دی، چہرے کو بھی بگاڑنے کی کوشش کی گئی اور باڈی کو بھی۔ جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی، لوگ چوراہے کی طرف دوڑ پڑے۔ ایک اژدہام جمع ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے پوری آبادی بس ایک ہی طرف کو دوڑ گئی۔ لوگوں میں زبردست غم وغصہ تھا۔ وہ مجرم کے خلاف سخت کارروائی کی مانگ کر رہے تھے۔ ابھی ابھی پارک کی تعمیر ہوئی تھی۔ اتنے شاندار پیمانے پر بت کی نقاب کشائی کی گئی تھی۔ پورے قصبے میں عوام الناس کا تقریباً ہر طبقہ شریک تھا۔

یہ خبر ایک احساس کے مانند اس وقت اس کے پاس پہنچی جب وہ مسجد سے نکل کر آہستہ آہستہ اپنے دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ فضا اچانک کچھ بدل گئی ہے، ہواؤں کا رخ بھی بے سمت ہو گیا ہے، کچھ گرد و غبار کی سی کیفیت......

اس نے ٹھہر کر ان باتوں کی اصلیت جاننے کی کوشش کی۔ اپنے اندر اچانک در آئے

محسوسات کو بڑی مشکلوں سے کسی طرح جسم کی کسی نامعلوم کال کوٹھری میں مقید کر دیا اور اپنے دماغ اور آنکھوں کو اس کام پر پوری مستعدی کے ساتھ لگا دیا۔

دماغ اور آنکھوں نے خبر دی کہ ہوائیں اپنی جانی پہچانی سمتوں میں رواں دواں ہیں، فضائیں معمول کے مطابق ہیں اور جو گرد و غبار سا دکھائی دیتا ہے، وہ وہم بھی ہو سکتا ہے۔

وہ مطمئن سا ہو گیا۔

لیکن نامعلوم کال کوٹھری سے اس کا منہ زور احساس کسی طرح نکل آیا اور اسے پھر تنگ کرنے لگا۔ سامنے ایک شناسا آ رہا تھا، اس کے چہرے پر دھند تھی۔

"کچھ سنا تم نے — ؟"

وہ حواس باختہ تھا۔

"کیا — ؟"

وہ اب بھی اپنے آپ پر قابو رکھے ہوئے تھا۔

"ارے...... اس بڑے آدمی کے بت پر کسی نے حملہ کر دیا......"

اس نے یوں خبر دی جیسے اس کی لاعلمی قیامت خیز تھی۔

اس کا احساس دیر سے اچھل کود رہا تھا لیکن اس نے اس اطلاع سے اس کا رشتہ جوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

"کسی کی شرارت ہوگی......"

اس نے قدرے لاپروائی دکھائی۔ اس پر شناسا کا انداز ایسا ہو گیا جیسے اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"آپ کو واقعی کچھ پتہ نہیں — ؟"

اس نے عجیب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ جھنجھلا گیا۔ آخر اتنی چھوٹی سی بات کو اتنی اہمیت کیوں دی جا رہی ہے۔ دنیا میں تو بہت

سی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ راہ گیروں کو بھرے بازار لوٹ لیا جاتا ہے، بچوں کو ماؤں کے شکم سے کھینچ کر آگ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ بت پر حملہ ہوا ہے تو مجرموں کو پکڑنے کی کوشش کرو، اس واقعہ کو چبا چبا کر بیان کرنے کا مطلب ــــ؟

مگر اس نے اپنے اندر اٹھے طوفان کو اپنے اندر ہی محدود رکھا اور بے نیازی کے عالم میں بولا۔

''اس میں پتہ لگنے والی بات کون سی ہے ــــ؟ اس قسم کے واقعات کوئی نئے ہیں کیا؟ دنیا میں تو بہت بت توڑے گئے ہیں......''

اس کی بے تکی لگنے والی بات پر شناسا سنجیدہ ہو گیا اور اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔

''آپ ابھی شاید اپنے محلے سے باہر نہیں نکلے ہیں، آپ کو اندازہ نہیں ہے، ذرا باہر نکلئے تو پتہ چل جائے گا......''

''کیا پتہ چل جائے گا ــــ؟ میں تو جا ہی رہا ہوں......''

وہ واقعی اکتا گیا۔

''اصل میں ان کے شک کی سوئی ہماری طرف ہو گئی ہے......''

شناسا نے اسے صاف صاف بتا دینے ہی میں عافیت سمجھی۔

وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس کے اٹھتے ہوئے قدم خود بخود رک گئے۔

''کیوں بھائی، شک کی سوئی ہماری طرف ہونے کی وجہ......؟''

''پتہ نہیں، یوں اپنی زبان سے کوئی کچھ نہیں کہہ رہے ہیں لیکن ان کی نگاہیں......''

''کوئی ضروری تو نہیں کہ ہم ان نگاہوں کے جو معنی نکالیں، وہ صحیح بھی ہوں......؟''

اس نے آہستہ سے شاید اپنے آپ کو مخاطب کیا۔

''اس کا فیصلہ تو آپ ان نگاہوں کو دیکھنے کے بعد ہی کریں گے......''

شناسا کا انداز معنی خیز تھا۔ اس کا راستہ آ گیا تھا، وہ اس طرف کو مڑ گیا۔

اسے محسوس ہوا کہ وہ چاروں طرف سے نکیلی برچھیوں سے گھر گیا۔ ساری برچھیاں ایک ساتھ اس کے جسم میں چبھنے لگیں۔ چبھن اتنی تیز تھی کہ وہ بلبلا اٹھا۔ شکر ہے کہ سارے معاملات داخلی تھے، خارجی ہوتے تو پتہ نہیں وہ کیسا تماشا بن جاتا۔ اس نے اپنے اندر ٹٹول کر اس تکلیف کو پکڑنے کی کوشش کی۔ سب کچھ صحیح سلامت تھا، پھر یہ چبھن — ؟

جب اس نے کچھ لوگوں کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تو شناسا کی بات فوراً اس کی سمجھ میں آگئی۔ ان نگاہوں میں وہ سب کچھ تھا جس کی خبر شناسا نے دی تھی۔

اس نے اپنی تشفی کے لئے کچھ اور آنکھوں میں بھی جھانکا۔ سارا کا سارا وہی سب کچھ ان سب کی آنکھوں میں بھی تیر رہا تھا۔ یوں جیسے یہ چیز ایک وبا کی طرح ہر جگہ پھیل گئی تھی۔

ایسے میں اسے کیا کرنا چاہئے — ؟

فوری طور پر بس یہ انتظار کہ ان آنکھوں میں جو کچھ ہے، اسکی ترسیل زبان کے ذریعہ بھی ہو۔

وہ بہت بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ انتظار...... انتظار......

دوسری طرف مکمل خاموشی تھی اگر اسے واقعی خاموشی کہا جائے۔ آنکھوں کے علاوہ انکے بدن کے سارے اعضا پر جو کچھ تحریر تھا، اسے وہ بخوبی پڑھ رہا تھا۔ یہ تحریریں بالکل خاموش نہیں تھیں، بے انتہا بولتی ہوئی، چاروں طرف گونج رہی تھیں، یوں زبان کے استعمال کی ضرورت نہیں تھی، پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ یہ زبان سے بھی ادا ہوں تا کہ رسم دنیا بھی پوری ہو جائے اور اسے مکمل تشفی حاصل ہو کہ جو کچھ اس نے دیکھا، سوچا، وہ سب صحیح تھا۔

لیکن کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا...... کسی کی زبان حرکت میں نہیں تھی، زبان کے علاوہ ساری چیزیں متحرک تھیں۔ ساری ہوا، ساری فضا، آسمان و زمین ......ساری دنیا بول رہی تھی، نہیں بول رہی تھی تو صرف ان کی زبان۔ یوں ان کی زبانیں ان معنوں میں متحرک تھیں کہ وہ بول تو رہی تھیں مگر دوسری باتیں، وہ باتیں جن سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ انہیں سن بھی نہیں رہا تھا، وہ صرف اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں، بے سر و پا،

بے شکل وصورت، وہ انہیں سمجھ بھی نہیں رہا تھا، وہ اس کے کانوں میں بج رہی تھیں۔ اس کا ذہن ودماغ صرف اور صرف ایک ہی بات سننا چاہتا تھا، وہ بات جو وہ ان کی آنکھوں میں پڑھ رہا تھا۔ اس کے ذہن ودماغ نے فی الحال اس کے کانوں کو صرف یہی سننے کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ جو باتیں بھی اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں، وہ کان کے پردے سے ٹکرا کر ادھر ادھر بکھر رہی تھیں۔

کچھ لوگ اس سے صرف خیریت اور موسم کی باتیں کرتے تھے۔

کچھ لوگ نگاہیں بچا کر نکل جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

کچھ لوگ جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر رہے تھے۔

کچھ لوگوں کا انداز یوں تھا جیسے وہ کوئی خطرناک بم ہے جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے، اس لئے اس سے دور ہی رہنے میں عافیت تھی۔

کچھ اسے تسلیم تو کر رہے تھے لیکن یوں جیسے ناگوار خاطر ہو۔

راتوں رات یا تو لوگ بدل گئے تھے یا وہ بدل گیا تھا۔

اس کی سمجھ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ایسا کیا کچھ ہو گیا ہے جس سے ساری صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔

بت پر نامعلوم افراد نے حملہ کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کے واقعات ہوئے تھے اور انہیں جانے بوجھے لوگوں نے انجام دیا تھا لیکن اس حملے میں ایسی کون سی بات تھی کہ سب کی نگاہوں میں اچانک ایک ہی تحریر درج ہو گئی تھی۔

اسے محسوس ہوا کہ وہ اجنبیت کے گھنے کہرے میں گھر گیا ہے۔ پہلے وہ کوئی پسندیدہ فرد نہیں تھا مگر یہی غنیمت تھا کہ وہ اجنبی نہیں تھا بلکہ اس وقت تک اس نے اجنبیت کا صرف نام سنا تھا، عملی تجربہ تو اسے اب ہو رہا تھا اور یہ تجربہ کتنا خطرناک تھا، اسے کچھ وہی سمجھ رہا تھا۔ وہ بازار کی بھیڑ میں تھا لیکن بالکل تنہا...... اکیلا...... اس کے آس پاس جو لوگ بھی

تھے، اس کے لئے بالکل انجان تھے، وہ اسے بالکل نہیں جانتے تھے، وہ اسے کینہ بھری نگاہوں سے بھی دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ ایک اجنبی ان کے درمیان گھس آیا ہے جو ان کا دوست نہیں اور وہ کسی وقت بھی انہیں نقصان پہنچا دے گا۔

وہ ان کی نگاہوں کی زد میں تھا۔ وہ چیخ چیخ کر انہیں بتانا چاہتا تھا کہ وہ ان کے لئے بالکل اجنبی نہیں تھا، وہ انہیں میں سے ایک ہے، انہیں کے جسم و جان کا ایک حصہ۔ اگر اس وقت وہ ان کے لئے اجنبی بھی ہے تو ان کا دشمن ہر گز نہیں، وہ انہیں کبھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ مگر یہ سب وہ انہیں کیسے سنائے، وہ تو اس کی باتیں سننے کو تیار ہی نہیں، وہ صرف اس سے رسمی باتیں سننا چاہتے ہیں۔

خیریت......

موسم......

مہنگائی......

سیاسی اور سماجی تبدیلیاں......

اور بھی بہت کچھ......

لیکن وہ ان سے وہ سننا چاہتا تھا جو ان کی نگاہوں میں تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ان کی نگاہیں الفاظ بن کر اس کے اندر اتر جائیں گی تو اس کی بے چینی دور ہو جائے گی، پھر وہ انہیں مطمئن بھی کر دے گا۔ مطمئن نہ بھی کرے، خود ضرور مطمئن ہو جائے گا، اس کے لئے یہی بہت ہوگا۔ آخر ہمت کر کے اس نے خود ہی اس پہاڑ کو کاٹنے کی پہل کی۔

ایک شناسا سے اس نے دریافت کیا۔

''وہ کون ہو سکتے ہیں بھائی جنہوں نے اس بت پر حملہ کیا، کیا بگاڑا تھا اس بچارے بت نے ان کا......؟

شناسا نے غور سے اس کی طرف دیکھا، منہ سے کچھ بولا نہیں۔ وہ سمجھا شاید اس نے اس

کی بات سنی ہی نہیں، یا سنی تو سمجھی نہیں۔ وہ پھر بولا۔

''بھلا بتایئے، ایک خوبصورت چیز بنی تھی اتنی محنت اور شوق سے۔ شہر کی خوبصورتی میں اس سے ایک اضافہ ہو گیا تھا۔ سارے لوگوں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا تھا، کن بدبختوں نے ایسی گھناؤنی حرکت کی......؟

وہ شخص اچانک کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ وہ احمق سا اس کا منہ تکنے لگا۔

''کیوں بھائی، آپ ہنسے کیوں — ؟ میں نے تو کوئی ایسی بات......

اس شخص کی ہنسی کو بریک لگ گئی۔

''نہیں...... بتایئے نا بھائی صاحب......؟''

اس نے اصرار کیا لیکن جب اس نے اس شخص کے چہرے کو دیکھا تو اس کا خون خشک ہو گیا۔ کہاں ابھی وہ ہنس رہا تھا، کہاں اب اس کے چہرے پر ایسی کرختگی آ گئی، گویا ہنسی کا کبھی وہاں گزر ہی نہ ہوا ہو، لیکن اچھی بات یہ ہوئی کہ وہ خاموش نہیں رہا۔ بہت کرخت لہجے میں اس نے جواب دیا۔

''ہنسوں نہیں تو کیا کروں، روؤں......؟''

اس پر فوری طور پر اسے کوئی بات نہیں سوجھی، قدرے توقف کے بعد اس نے اپنے لہجے میں شگفتگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''یہ حملہ صرف ایک پر نہیں ہوا ہے بھائی، ہم سب پر ہوا ہے......''

''کیوں......؟ آپ کے یہاں تو بت پرستی حرام ہے، آپ کے یہاں تو روایت بت شکنی کی رہی ہے......''

شناسا نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا، اسے پھر فوری طور پر کوئی جواب نہیں سوجھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔

''لیکن یہاں بت پرستی کا کیا سوال ہے۔ یہ بت کسی مذہبی شخصیت کی علامت تو تھا نہیں

یہ تو ایک زندہ آدمی کی عقیدت میں تعمیر ہوا تھا۔ اس کا کسی مذہب سے کیا تعلق ـــ ؟''
''چلئے، تسلیم کرلیا کہ اس مخصوص بت کا آپ کے مذہب سے کوئی تعلق نہیں، لیکن یہ بات تو صحیح ہے نا کہ بت پرستی آپ کے یہاں حرام ہے!''
وہ شخص باقاعدہ جرح پر اتر آیا۔ وہ لمحہ بھر کے لئے لڑکھڑایا ضرور، لیکن پھر یہ سوچ کر فوراً سنبھل گیا کہ کم سے کم وہ کھلا تو سہی، حبس کی کیفیت تو ختم ہوئی، آنکھوں میں چھائے ہوئے اجنبیت کے مہیب سائے تو کچھ دور ہوئے۔ وہ بحث کر رہا ہے تو کرے، زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ وہ قائل ہو جائے گا یا قائل کر دے گا۔
اس نے بڑی متانت سے جواب دیا۔
''دیکھئے بھائی صاحب، بت پرستی کے حرام حلال ہونے کا سوال نہیں ہے، اصل چیز یہ ہے کہ دوسروں کے مذہب کا احترام، جس کی ہمارے یہاں سخت تاکید ہے۔''
مذہبی آزادی ہمارے مذہب اور کلچر کا ایک حصہ ہے اور......''
''آپ پتہ نہیں کہاں کی ہانک رہے ہیں ـــ ''اس نے بڑی تیزی اور ترشی سے اس کی بات کاٹی ـــ ''بت شکنی کے قصے سے تو آپ کی پوری تاریخ اٹی پڑی ہے۔ آپ آج بھی یہی کر رہے ہیں، کہئے تو کچھ تازہ مثالیں پیش کروں......''
وہ تلملا گیا۔ جواب دے سکتا تھا، لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ اس کا کوئی معقول جواب بھی بے معنی ہوتا۔ اس نے بحث میں الجھنے کی جگہ بات کو دوسرا رخ دینے کی کوشش کی۔
''اب تاریخ میں کیا لکھا ہے، میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں نا، میں تو آج کی بات کر رہا ہوں۔ آج جس نے بھی اس قسم کی حرکت کی ہے اس کی سخت مذمت ہونی چاہئے......''
شناسا نے اسے ایک ایسی بھرپور نگاہ سے دیکھا جس میں لاتعداد پراسرار رنگ تھے، پھر اپنے ہونٹوں پر ایک خاص قسم کی مسکراہٹ بکھیر کر بولا۔
''اگر آپ واقعی جینوین ہیں تو اس واقعہ کی مسجد میں بیٹھ کر مذمت کیجئے......میرا مطلب

ہے آپ سب لوگ......"

وہ بھونچکا سا اسے دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہیں بدستور اس پر جمی رہیں۔

وہ ایک ایسی محفل تھی جس میں تقریباً ہر شخص دور کی کوڑی لے کر حاضر ہوا تھا۔ ہر ایک کے پاس ایک الگ ہی خبر تھی، دوسروں کی لائی ہوئی خبر سے بالکل مختلف۔ ہر ایک کے پاس اپنا منفرد نکتۂ خیال تھا، ہر ایک کے پاس اپنا ذاتی احساس۔ یعنی اس محفل کی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں جو چیز بھی تھی دوسری چیزوں سے بالکل الگ۔ خیالات کو اگر نمبرواری ترتیب دی جائے تو اس کا نقشہ شاید کچھ یوں ہوتا۔

نمبر ایک — بھئی، یہ بھی خوب رہی، اس بت پر خواہ مخواہ کسی نے اپنا غصہ اتارا......

نمبر دو — آپ کو پتہ ہے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس خبر سے کچھ لوگ اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے ناچنا اور گانا شروع کر دیا۔

نمبر تین — ناچنا اور گانا — ؟ یہ تو کچھ لوگوں کا پیشہ بھی ہے، وہ ایسا نہ کریں تو ان کا پیٹ نہ بھرے۔

نمبر چار — آپ اسے مذاق میں اڑا رہے ہیں — ؟ معاملہ کتنا سیریس ہے آپ کو اندازہ ہے کچھ — ؟

نمبر تین — یعنی......؟

نمبر چار — یعنی یہ کہ کچھ لوگوں نے تصویری شہادت کے ساتھ یہ بات اڑا دی ہے کہ کچھ لوگ اس حملے سے بہت خوش ہیں، اس کی بربادی کا جشن منا رہے ہیں۔

نمبر تین — اول تو یہ بات بہت احمقانہ ہے کہ دوسروں کی بربادی کا جشن منایا جائے، بالفرض کچھ پاگل سرپھروں نے ایسا کیا بھی تو اس کا الزام سب پر کیسے آئے گا — ؟

نمبر چار — آپ ایک بہت بڑی بھیڑ کے سامنے کیسے ثابت کیجئے گا کہ یہ بات غلط ہے؟

نمبر تین ــــ ہم ان کے پاس جائیں گے اور ان کے سامنے اپنی پوزیشن واضح کریں گے، ہم انہیں بتائیں گے کہ......

نمبر ایک......

نمبر دو......

نمبر چار......

نمبر پانچ......

نمبر چھ......

بلکہ وہاں موجود سارے نمبروں نے نمبر تین سے بس ایک بات پوچھی۔

''آپ کی باتوں سے وہ قائل نہ ہوئے تو ــــ ؟''

نمبر تین ــــ اب وہ قائل نہیں ہونا چاہتے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔

نمبر چار ــــ تو فی الحال معاملہ یہی ہے، وہ ہماری کسی بات سے قائل ہونا نہیں چاہتے۔ اس لئے ہم اس سے آگے کی کوئی بات سوچیں تو بہتر ہے۔

نمبر تین ــــ اس کا مطلب ہے، یہ کوشش ہو چکی ہے۔؟

نمبر چار ــــ شاید......ہم میں سے کچھ ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔ انہوں نے پلک جھپکتے ہی یہ کام کر ڈالا۔ انہیں فوراً احساس ہو گیا تھا کہ وہ رونگ باکس میں پڑ گئے ہیں۔

سب خاموش ہو گئے، نمبر تین بھی، ویسے بھی زیادہ تر لوگ الفاظ کو اپنے احساسات کے اظہار کا ذریعہ نہیں بنا رہے تھے، ان کے اعضا ان کے احساسات کی ادائیگی میں تن من سے لگے تھے۔ اس وقت لمحہ خاموشی کا نہیں آ گیا تھا بلکہ یہ ان کی سوچ کا ایک پڑاؤ تھا، جو اچانک آ گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد نمبر تین نے سب کو مخاطب کیا۔

''تو گویا اب اس پہ اصرار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ چند گمراہ لوگوں کی حرکت سے، جن کی تشفی بخش نشاندہی بھی نہیں ہو سکی، سب کے سر پر الزام نہیں آنا چاہئے۔ الزام لگ چکا

اور ہم جانے انجانے میں کٹہرے میں کھڑے ہو چکے۔ اب تو بس یہ ہے کہ ہم کیا کریں، کیا کہیں۔''

سوچ کا دوسرا پڑاؤ آ گیا۔ سارا قافلہ اس پڑاؤ پر کچھ دیر رکا رہا۔ پھر ان میں سے ایک آگے بڑھا جس کی پہچان نمبر سے نہیں ہو سکی تھی، اس نے مخاطب تو نمبر تین کو کیا لیکن دراصل وہ سارے حاضرین کو خطاب کر رہا تھا۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارے کچھ کرنے، ہمارے کچھ کہنے سے، ہمارے سروں پر دھرا الزام ڈھل جائے گا ——؟''

نمبر تین —— ہوں ...... بات تو آپ نے صحیح دریافت کی، لیکن ابھی ابھی ایک دوسرے سوال نے میرے اندر جنم لیا ہے۔ اس کا تعلق ہم سے اور صرف ہم سے ہے۔ ہم اس کا خود جواب دے لیں اور خود مطمئن ہو جائیں تو شاید ہم انہیں بھی مطمئن کر سکیں گے......''

اس پر ایک عجیب قسم کا غوغہ اٹھا، جو شور بھی نہیں تھا اور خاموشی بھی نہیں۔ وہ ایک دبی دبی سی کیفیت تھی جسے کوئی واضح نام دینا بھی ممکن نہیں تھا۔ لگتا تھا جیسے سب لوگوں کے دلوں میں بہت سے سوالوں نے ایک ساتھ جنم لے لیا ہو یا ہو سکتا ہے، ایک ہی سوال نے سب کے دلوں میں ایک ساتھ جنم لیا ہو، منظر کچھ ایسا تھا جیسے سورج نکلنے سے پہلے صاف شفاف افق ہوتا ہے...... اضطراب آمیز ...... کسی بڑی چیز کے برآمد ہونے کے آثار......

زبان سے کسی کے ایک لفظ نہیں نکلا لیکن سوال کرنے والے کے اندر سب کا اضطراب پہنچ گیا اور نمبر تین نے صاف لفظوں میں کہا۔

''پہلے آپ یہ فیصلہ کریں کہ اس واقعہ سے آپ کو واقعی تکلیف پہنچی ہے یا آپ ......؟ اگر ہم نے آپس میں متفقہ طور پر اس سوال کو حل کر لیا تو پھر......''

ایسا محسوس ہوا جیسے سورج نہیں، آگ کا ایک بہت بڑا گولہ نکل آیا...... اس کی تپش اتنی تیز

تھی کہ آس پاس کی ساری چیزیں اس میں جھلس گئیں، جواس سے دور بھاگا، وہ بھی اس کی تپش سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ جس نے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی اس کا جسم بھی جل گیا، جو بالکل لاتعلق بنا رہا، اس کی بھی کم سے کم انگلیاں ضرور جھلسیں۔ آناً فاناً ایک عجیب منظر طاری ہو گیا۔ جلتی ہوئی ایک ایسی ہوا چلی جس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ نمبر تین کو ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ جو بات اس کے منہ سے ایک مشورے کے طور پر نکلی، وہ بات اتنی دور تک جائے گی۔ اس پورے واقعہ کا سب سے اہم اور دلچسپ پہلو یہ تھا کہ سارے لوگ اچانک الفاظ سے محروم کر دیئے گئے تھے۔ کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا، جو بولنا چاہ بھی رہا تھا وہ بھی مجبور تھا۔ لیکن الفاظ کے چھن جانے کے باوجود وہ تمام باتیں جو وہ سوچ رہے تھے، وہ سب کی سب دوسروں پر آشکار ہو رہی تھیں۔ ان کے درمیان ایک خاموش مگر مضبوط Comminication قائم ہو گیا تھا، کہیں پر کوئی رکاوٹ نہیں تھی، بظاہر جو رکاوٹ نظر آ رہی تھی، وہ سراسر نظر کا دھوکہ تھا۔

اس سوال پر دراصل وہ آپس میں منقسم ہو گئے تھے، اس لئے الفاظ کے استعمال کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا، شاید الفاظ ان کے لئے آگ کے گولے بن چکے تھے کہ جسے ہاتھ لگاتے ہی ان کے ہاتھ جل اٹھیں گے۔ لیکن نمبر تین بھی بضد تھا کہ یہاں سے کوئی فیصلہ کر کے ہی اٹھے گا وہ بار بار ان سے کہتا رہا اور وہ بار بار چپ ہو رہے۔

یہ واقعہ تھا کہ ان کے لئے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ اس حملے سے وہ خوش ہیں یا ناخوش۔

انہیں خیال آتا کہ یہ اس شخص کا بت تھا جس نے ہمیشہ انہیں ستایا، دھوکہ دیا۔ انہوں نے اسے اپنا حاکم جانا لیکن اس نے اپنے دل سے کبھی اپنا محکوم نہیں مانا، مانا بھی تو غلام...... بدترین غلام...... وہ جب بھی اس کے پاس اپنی امیدیں لے کر گئے، اس نے ان امیدوں کو پورا نہیں کیا، کبھی سنگ دلی کے ساتھ، کبھی یوں کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلا۔

اس نے انہیں نہایت چالاکی اور عیاری سے نفسیاتی دھوکے میں مبتلا رکھا، وہ ہمیشہ اس کے بھرم میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور وہ قیمتی وقت دبے پاؤں ان کے پاس سے گزر گیا جس میں وہ کچھ کر سکتے تھے۔ وہ خود کچھ کرتے تو ضرور کامیاب ہوتے، سو فیصد نہ سہی، پچاس فیصد، پچاس فیصد نہ سہی پچیس فیصد، پچیس نہ سہی، دس فیصد، دس فیصد نہ سہی ایک ہی فیصد۔ اس وقت انہیں یہ تشفی تو ہوتی کہ انہوں نے اس ایک فیصد کامیابی کو خود سے حاصل کیا، یہ چیز سو فیصد ناکامی سے تو بدرجہا بہتر تھی۔ اپنی بے عملی کا ذمہ دار بھی وہ اسے ہی سمجھتے......اس عالم میں انہیں محسوس ہوتا کہ جس نے بھی اس بت پر حملہ کیا، صحیح کیا، کم سے کم یہ تو ثابت ہوا کہ وہ ناتسخیر نہیں ہے، آج اس کے بت پر حملہ ہوا کل کو اس پر بھی حملہ ہوسکتا ہے۔

لیکن جب وہ سوچتے کہ اس بت کی تعمیر و تشکیل میں ان کا بھی ایک چھوٹا سا حصہ تھا، بادل ناخواستہ ہی سہی، انہوں نے بھی اپنی کمائی کا ایک حصہ اس میں لگایا تھا، اس کی خوبصورتی اور سجاوٹ میں وہ بھی ایک حصہ رہے تھے، اس کی تعمیر کی سوچ میں ایک گنا وہ بھی شریک رہے تھے۔ انہیں بھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کی تعمیر سے ان کے شہر اور علاقے کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا ہے، یہاں سے گزرتے وقت ان کی نگاہیں بھی اس طرف اٹھتی تھیں۔ اس وقت انہیں لگتا کہ جس نے بھی یہ کام کیا، ٹھیک نہیں کیا، اس نے ان کے شہر کی خوبصورتی پر بٹہ لگا دیا۔ ان کے اٹھے ہوئے سر کو نیچا کر دیا۔ سب لوگوں کے ساتھ وہ بھی اس حملے میں مجروح ہوئے۔

ان کی سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ وہ اس موقع پر اپنا کون سا موقف اپنائیں۔ نمبر تین ٹھیک ہی کہتا تھا کہ جب تک ان کا ایک واضح موقف نہیں بن جاتا وہ کھل کر کوئی بات نہیں کر سکتے۔ مگر یہ بات کہنے میں جتنی آسان لگتی تھی، دراصل تھی نہیں۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ موجودہ صورت حال میں وہ کوئی ایک موقف اپنانے کے اہل بھی

نہیں۔ وہ حملے کی مذمت کا موقف اپناتے ہیں تو ایسے لوگوں کی ہرگز کمی نہیں جو آخری دم تک اس کی مخالفت کریں گے، حملہ آوروں کی ہمدردی کا موقف اپناتے ہیں تو بے شمار لوگ ان کا ساتھ نہیں دیں گے۔ ایسے میں ان کا کسی ایک موقف پر جم جانا مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا۔ وہ ناممکن کے مائل اسٹون پر سو فیصد متفق ہوئے تو انہیں احساس ہوا کہ اب تک انہوں نے خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کیا، وہ بھرم میں پڑے رہے جب کہ حقیقت تو بالکل سامنے تھی۔

اب صورت حال بالکل واضح ہو گئی تھی۔
اب کسی چہرے پر لکھے کو پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔
بات کی ترسیل اب اشارے کنایوں میں نہیں ہو رہی تھی۔ اتنے دنوں سے جو کچھ چہروں پر لکھا نظر آ رہا تھا، وہ سب اب زبانوں پر آ گیا تھا۔
گویا دھند صاف ہو گئی تھی اور مطلع روشن ہو گیا تھا۔
انہیں نہ جانے کیوں یہ یقین ہو گیا تھا کہ بت پر حملہ کرنے کا فعل انہیں لوگوں کا ہے۔ انہیں میں سے کوئی ایک ...... ان کے پاس کچھ ایسے ثبوت بھی پہنچ گئے تھے جن سے ان کے یقین کو تقویت مل رہی تھی۔ ان کے پاس ناچتے گاتے، جشن مناتے کچھ ایسے لوگوں کی تصویریں آ گئی تھیں جن کی شباہت ان لوگوں سے ملتی تھی اور کسی نے ان کے اندر بہت مضبوطی سے یہ بات ڈال دی تھی کہ یہ جشن حملہ ہونے کی خوشی ہی میں منایا گیا ہے۔
اور یہ بات تو صحیح تھی کہ ان میں سے کچھ اس حرکت سے ناخوش نہیں تھے، یوں موقع مصلحت کی مناسبت سے وہ اپنی زبان سے اس کی مذمت بھی کرتے تھے لیکن لوگ تو ان کے چہرے پڑھ چکے تھے، چہرے پر لکھا ہوا کچھ اور ہی کہتا تھا۔ ان کی زبانی مذمت انہیں مضحکہ خیز بنا رہی تھی۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ ان کے مبینہ اس عمل سے

دوسروں کے دل میں ان کا خوف بیٹھ گیا ہے اور ان کا سر کچھ بلند ہوا ہے۔ حالانکہ ان میں کچھ ایسے لوگ ضرور تھے جنہیں واقعی اس حرکت سے تکلیف پہنچی تھی، لیکن ان کی تکلیف نقار خانے میں طوطی کی آواز تھی۔ ان کی اس بات کو کوئی تسلیم بھی نہیں کرتا تھا کہ وہ ایک خوبصورت اور قیمتی بت پر حملہ کئے جانے سے مغموم ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ بت پرستی تو آپ کے یہاں حرام ہے، بتوں کو توڑنے والے آپ کے ہاں ہیرو ہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہے۔ اس لئے سو فیصد لوگ اس واقعہ سے خوش تسلیم کئے گئے۔

ایسی صورت حال میں نمبر تین کے اس مشورے کی کیا اہمیت رہ جاتی تھی کہ وہ ایک واضح موقف اپنائیں۔ وہ واضح موقف اختیار بھی کر لیتے اور اس واقعہ کی کھل کر مذمت بھی کر دیتے تو کیا ضروری تھا کہ لوگ ان کی بات کو سچ ہی تسلیم کر لیتے۔

بداعتمادی پہلے بھی تھی لیکن یہ بداعتمادی ایک سمٹی سمٹائی، گول مٹول گیند جیسی تھی جس کی گود میں یہ گیند آتی، وہی اسے سہلانے لگتا، اس کا دل بھر جاتا تو وہ اسے دوسری گود کی طرف اچھال دیتا، سہلانے کا کام اب دوسری گود میں ہوتا، پھر تیسری گود، پھر ...... لیکن جہاں بے شمار گود ہوں وہاں باری باری سے اسے سہلانا ...... اس میں تو ایک جگ بیتنا تھا اور ایک جگ بیت رہا تھا لیکن ایک عجیب و غریب حرکت نے اس گول مٹول سی چیز کی صورت ہی بدل دی ...... کھول کر اسے پھیلا دیا، یوں کہ ساری دنیا اس کے حلقے میں آ گئی۔ تب جا کر پتہ چلا کہ وہ گول مٹول چیز اندر سے کتنی مضبوط اور پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں اتنی قوت تھی کہ وہ ساری دنیا پر چھا جائے۔ اس میں کوئی روزن، کوئی سوراخ بھی نہیں تھا جس سے باہر کی چمکیلی دھوپ اور تازہ ہوا اندر آ سکے۔

اس صورت حال میں بس ایک ہی راستہ کھلا تھا ...... آپس میں مل بیٹھ کر اپنے اندر کے غبار کو نکالنے کی کوشش۔ ویسے یہ کام وہ پہلے بھی کرتے رہے تھے، بہت دنوں سے کرتے آ رہے تھے۔ اس کوشش میں انہیں سو فیصد کامیابی تو نہیں ملتی تھی، لیکن وہ کسی

حد تک ہلکے ہو کر ضرور اٹھتے تھے۔

سب کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔

ان کے بھی جو واقعی دکھی تھے اور ان کے بھی جو اندر سے خوش تھے مگر اپنے چہروں پر دکھ کا ماسک چڑھائے ہوئے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اندر سے بھی خوش تھے اور انہوں نے دکھ کا ماسک بھی نہیں چڑھایا تھا۔ ان کے چہرے بھی لٹکے ہوئے تھے اور ان پر چاروں طرف سے سوالیہ نشان سے بھری نگاہیں ٹکی ہوئی تھیں۔

اس محفل کی شروعات ہی خاموش ڈھنگ سے ہوئی، یعنی کوئی کچھ نہیں بولا، سب چپ رہے لیکن کب تک چپ رہتے وہ بولنے ہی کے لئے تو جمع ہوئے تھے۔

نمبر تین نے ابتدا کی۔

''آج جس دھند نے ہمیں گھیر رکھا ہے اس کی میں نے قبل ہی پیش گوئی کر دی تھی......''

''تو اس سے فرق کیا پڑا — ؟''

سوال کے جواب میں سوال ہی داغا گیا، وہ بھی ایک ایسے نمبر کی طرف سے جس کا کوئی نمبر ہی نہیں تھا۔

''اس وقت ہم ایک واضح موقف اختیار کر لیتے تو شاید آج......''

نمبر تین نے کہنا چاہا لیکن اس کی بات درمیان ہی میں کٹ گئی۔

''آج کے حالات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑا، ہم کوئی بھی مؤقف اختیار کرتے، ہوتا وہی جو آج ہوا......

خاموشی پھر درمیان آگئی۔ وہ لوگ خاموشی کے ہاتھوں پہلے ہی پریشان تھے، اسلئے خاموشی جب بھی اور جس شکل میں بھی آتی، وہ اسے فوراً بھگانے کی کوشش میں لگ جاتے۔

''ان باتوں کو اکھاڑنے کا اب کیا حاصل — ؟ ہم یہ کرتے تب یہ ہوتا، ہم وہ کرتے تب......کیا یہ بات ابھی تک صاف نہیں ہوئی کہ ہم پہلے ہی چاروں طرف سے گھیر لئے

گئے تھے، ہم کچھ بھی کرتے ،تو یہی ہوتا جو ہوا......''

''چلئے ، مان لیتے ہیں، آپ کی بات صحیح ہے،لیکن یہ تو سوچیں کہ جب گھیر ہی لئے گئے ہیں تو کیا یونہی گھرے رہیں — ؟اس سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں،کوئی راستہ نہیں بچا باہر نکلنے کا— ؟''

یہ درمیان کی ایک آواز تھی،کوئی دوسری آواز نہیں ابھری، کچھ کھسر پھسری ضرور ہوئی، کچھ بے چینی سی ......کچھ پہلو بدلنے کی آوازیں ......شاید درمیان کی اسی آواز کو سب کی خاموش حمایت حاصل تھی۔ عین اسی وقت کچھ لوگ تقریباً بھاگتے ہوئے آئے ، کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں پائی تو دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے، کچھ لوگ پہلے سے بھی دیوار سے لگ کر کھڑے تھے، خاموش......باہر سے آنے والوں میں سے ایک نے چلا کر کہا۔

''ہم گھیر لئے گئے تو ہم خوش قسمت ہیں۔ہمیں اپنے آپ کو جانچنے کا، اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا ہے۔اس سنہری موقع کو اتنی آسانی اور بے دردی سے ضائع نہیں ہونا چاہئے۔''

''ضائع — ؟''

کئی سوالیہ نگاہیں ان کی طرف اٹھ گئیں۔الفاظ کو زبان کی سواری کی ضرورت نہیں تھی۔

''ہاں ......ضائع......ہم جو بھی اپنے بچاؤ کے راستے سوچنے پر آمادہ ہوئے تو یہ ایک سنہری موقع ضائع کرنے کے مترادف ہے، ہم بچاؤ کے راستے تلاش نہیں کر رہے، فرار کی راہیں ڈھونڈ رہے ہیں، یعنی یوں ہم اجتماعی خودکشی کی راہ تلاش کر رہے ہیں......''

ایک عجیب قسم کا اضطراب پیدا ہو گیا۔ سب لوگ، جو ابھی تک خاموش تھے، اچانک بولنے لگے، کئی طرح کی ملی جلی آوازیں...... پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کون کیا بول رہا ہے۔

سبھی آوازیں گڈمڈ سی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ باہر سے آنے والوں نے ان کے درمیان بم چھوڑ دیا ہے اور سب لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔

مطلع صاف ہوا تو ایک سہمی ہوئی آواز سامنے آئی۔

''تو اب کیا کریں — ؟''

فوراً جواب ملا۔

گھبرانے کی ضرورت نہیں، ہمارا راستہ کبھی بند نہیں ہوا۔ ہمارا راستہ ہمیشہ سے کھلا ہے، اس میں آج اور وسعت آئی ہے، ہمیں اسی راستے کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے......''

حوصلہ افزا باتوں سے چہروں پر چھائے ہوئے تناؤ دور ہوئے، کچھ ٹھنڈی سانسیں نکلی۔ اوپر اوپر جو گرم ہوائیں چل رہی تھیں، ان میں بھی کمی آئی، لیکن مبینہ راستہ ان کی دسترس سے ابھی بھی بہت دور تھا۔ وہ سب ایک دوسرے کے چہرے پر ہی اس راستے کو تلاش کرنے لگے۔ مگر دوسروں کے چہروں پر بھی وہی کچھ تھا جو ان کے چہروں پر تھا۔ مایوس ہو کر انہوں نے آنے والوں کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی، وہاں سرخی تھی، روشنی تھی، جوش تھا، لیکن راستہ......؟''

وہ لوگ طنزیہ انداز میں مسکرائے اور انہیں یوں دیکھا جیسے کوئی ٹیچر کلاس میں اپنے طالب علموں کو دیکھتا ہے، ایسے طلبا کو جو ٹیچر کے سوال کا جواب نہیں دیتے، صرف اس کا منہ تکتے رہتے ہیں۔

''میں جانتا تھا آپ اپنے آگے پیچھے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ آپ کی پشت پر کون کھڑا ہے اور آپ کے آگے کا راستہ آپ کو کہاں لے جائے گا۔ جانئے، جانئے، اپنے بارے میں جاننے کی کوشش کیجئے، دوست دشمن کو پہچانئے، اپنے منصب کو یاد کیجئے۔ آپ یہاں کس کام کیلئے بھیجے گئے تھے اور کیا کر رہے ہیں......''

بولنے والا بولتے بولتے رک گیا۔ کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کی تقریر کا حاضرین پر فی الفور کیا اثر پڑا۔

یہ واقعہ تھا کہ اس کی تقریر کے پہلے ٹکڑے کا حاضرین پر خاطر خواہ اثر پڑا تھا، سب کے چہرے تمتما اٹھے تھے اور ان کی آنکھوں میں تیز قمقمے جل اٹھے تھے۔ اس نے ان پر ایک

فاتحانہ نگاہ ڈالی اور آگے بڑھا۔

''تو بھائیو — موجودہ حالات سے گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں، اصل میں یہ ہماری آزمائش کا لمحہ ہے، ہمارے امتحان کا وقت ہے اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ آزمائش میں اسے ڈالا جاتا ہے اور امتحان اسی کا لیا جاتا ہے جو اس کا اہل ہوتا ہے۔ آج یہ موقع ہم پر آیا ہے، اس کا مطلب ہے آزمائش میں ڈالنے والے نے، امتحان لینے والے نے ہمیں اس قابل سمجھا۔ اٹھئے، نیند سے جاگئے، اس آزمائش میں پورا اترنے کیلئے کمر بستہ ہو جایئے۔ دل میں اس یقین کو، بٹھا لیجئے کہ فتح آخر کار ہماری ہی ہوگی......''

تقریر کے اس حصے کا بھی خاطر خواہ اثر ہوا۔ چہرے کی تمتماہٹ، تمازت میں بدل گئی اور ٹھنڈی سانسوں کی جگہ نعرے بلند ہونے لگے۔ ایک آدمی مارے جوش کے کھڑا بھی ہو گیا اور پتہ نہیں اس عالم میں وہ کیا کرتا کہ کچھ لوگوں نے اسے ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔ اپنی بات کہنے والا مسکرا مسکرا کے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ اصل بات زبان پر لانے کے لئے شاید وہ مناسب ترین زمین تیار کر رہا تھا اور یہ صرف اسی کو پتہ تھا کہ مناسب زمین کون سی ہے۔ وہ پھر آگے بڑھا۔

''لوگ آپ کو طرح طرح کا خوف دلائیں گے، خوفناک اور ہولناک چیزوں سے ڈرائیں گے، آپ کی آنکھوں کے سامنے تاریک مستقبل کی ایک پوری بساط بچھا دی جائے گی، مگر آپ کو ان چیزوں کی پروا نہیں کرنی۔ آپ کے اندر جو شمع جل رہی ہے، تاریک راہوں میں وہی آپ کی رہنمائی کرے گی اور آپ کو منزل مقصود تک پہنچائے گی۔ ساری آندھیوں اور سارے طوفان سے آپ کو اس شمع کو بچائے رکھنا ہے......''

جو بات وہ سننا چاہتے تھے، وہ بات اس کی زبان پر آ ہی نہیں رہی تھی، جو باتیں وہ کر رہا تھا، کم و بیش وہ باتیں ان کے اندر پہنچ چکی تھیں اور اب وہ ایک ہی بات سننا چاہتے تھے......بس ایک ہی بات......

لیکن وہ بات زبان پر لانے سے پہلے اس نے ان سے پوچھ ہی لیا۔

''تو آپ پہلے یہ بتائیں کہ آپ میں سے کتنے ایسے ہیں جو اس پیغمبر کی تقلید کرنے کو تیار ہیں جو اللہ کے حکم پر اپنے لخت جگر کو قربان کرنے کے لئے پہاڑ پر گیا تھا ـــــ ؟''

اس پر جوش وخروش تو بہت پیدا ہوا، لیکن کسی نے باقاعدہ کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے پھر ایک سوال داغا۔

''اچھا، آپ میں سے کتنے ہیں جو کسی عظیم مقصد کے حصول کے لئے، اپنے پیدا کرنے والے کے حکم پر گلیوں اور سڑکوں پر پتھر کی چوٹ برداشت کر سکتے ہیں؟ سر سے پیر تک لہولہان ہو جائیں لیکن منہ سے اف تک نہ نکلے ـــ ؟

اس پر تو کچھ لوگوں کے منہ سے سسکیاں نکل گئیں۔ ان کے چہروں کی تمتماہٹ بڑھ گئی اور ان کی زبانوں پر بے ساختہ نعرے گونج اٹھے۔

انہوں نے ایک دوسرے کے کانوں میں پتہ نہیں کیا پھونکا......

سب کچھ ہوا لیکن ان کی زبانوں پر سوال کا جواب نہیں آیا۔

سوال کرنے والے نے برا سا منہ بنایا اور تلخ لہجے میں بولا۔

''آپ نعرہ بازی بہت کرتے ہیں اور اپنے ایمان کا ڈھونڈورہ پیٹتے ہیں، پر جب اپنے آپ کو ٹٹولنے کا موقع آتا ہے تو آپ اس کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتے۔ اس کا کیا سبب ہے، کبھی سوچا آپ نے ـــ ؟''

زیادہ تر نگاہیں جھک گئیں۔ کچھ نگاہیں سوال کرنے والے کے چہرے پر جواب ڈھونڈنے لگیں۔

نشستیں باقاعدہ منعقد نہیں ہوتی تھیں، خود بہ خود برپا ہو جاتی تھیں۔ یعنی جہاں ایک سے دو ہوئے، دو سے تین، تین سے چار...... بس اسے نشست مان لیا جاتا۔ اس کی

کوئی قانونی تعریف مقرر نہیں تھی ۔ کہیں کہیں اور کبھی کبھی چھوٹے بڑے جلسے بھی ہو جاتے ۔ان نشستوں کی نوعیت زیادہ تر اپنی لاشعوری گھبراہٹ پر قابو پانے کے لئے تھی۔ اسی گھبراہٹ اور بدحواسی میں کبھی اپنے آپ کو فاتح قرار دیا جاتا، کبھی مفتوح، یہاں تک کہ مظلوم بھی، لیکن گھبراہٹ کسی نہ کسی شکل میں حاوی رہتی۔ اگرچہ سننے والے اور دیکھنے والے ان نشستوں بلکہ آپس میں ملنے جلنے کو بھی طرح طرح کے معنی پہناتے۔ ہر شخص کی نگاہوں میں ان کے لئے الگ معنی تھے۔ وہ ان نشستوں کو میٹنگ کہتے تھے، شاید انگریزی نام دینے سے ان کی معنی خیزی بدل جاتی ہو۔

وہ چند لوگ اچانک اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس کے لئے پہلے سے کوئی ایجنڈا بالکل طے نہیں تھا لیکن شعور میں یقیناً کہیں پر تھا۔

ان میں سے ایک نے آہستہ...... بہت آہستہ سے کہا۔

’’جانتے ہو، اس دن کتنے لوگ تھے ــــ ؟‘‘

’’اس دن ــــ ؟‘‘

دوسرے نے انجان بن کر پوچھا۔ حالانکہ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا، دوسرے بھی تیسرے بھی......

’’ارے، اسی دن، جس دن وہ آیا تھا۔‘‘

پہلے والے نے قدرے جھنجھلا کر جواب دیا، یوں اس کی جھنجھلاہٹ بھی بناوٹی تھی۔

’’کس دن بھائی ــــ ؟‘‘

تیسرے نے خواہ مخواہ ایکٹینگ کرنے کی کوشش کی۔

پہلے والے نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا اور سب کے چہروں کو بغور دیکھنے لگا۔ جو بول رہے تھے، جو بول چکے تھے، جو خاموش تھے، سب کے چہروں پر ایک ہی تاثر تھا۔

ایک ہی تاثر......

خود اس کے چہرے پر بھی یقیناً وہی تاثر تھا جسے دوسرے پڑھ رہے تھے۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''ارے بھائی، اسی دن، جس دن ہم وہاں جمع ہوئے تھے، وہاں پر وہ لوگ آئے تھے اور نعرہ تکبیر......''

اسے محسوس ہوا کہ شاید سب نے ٹھنڈی سانس لی، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، یہ اس کا اپنا واہمہ تھا۔ ٹھنڈی سانس تو اس نے بھی نہیں لی تھی، اندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ایسا کچھ ہوا ہو تو اسے اس کی خبر نہیں تھی۔

''تو ــــ ؟''

دوسرے نے دھیرے سے پوچھا۔

''آپ کو یاد ہے، وہاں کتنے لوگ تھے ــــ ؟''

اس نے پوچھا۔ سب کے چہرے پر اکتاہٹ کے ہلکے آثار نمودار ہوئے۔ تیسرے نے جواب دینے کی جگہ دریافت کیا۔

''اس بات کو یاد رکھنے کی ضرورت کیا ہے ــــ ؟''

''ہے...... ہے نا، میں بتاؤں گا تو آپ اس کی اہمیت سمجھ جائیں گے۔''

پہلے کے لہجے میں ایک خاص قسم کا اعتماد تھا۔

''ساٹھ ستر ہوں گے۔ وہاں تو بیٹھنے کی اتنی جگہ بھی نہیں تھی، کچھ لوگ کھڑے ہوئے بھی تھے......''

دوسرے نے جواب دیا۔

''یعنی آپ کو صحیح تعداد کا پتہ نہیں ــــ ؟''

پہلے نے پوچھا۔

''بس، اسی تعداد کے آس پاس ہوگی، چلیے سو (۱۰۰) مان لیجیے......''

تیسرا اکتا گیا۔

''جب مان کر چلنے کی بات ہے تو پھر اتنا کم کیوں مانئے، دوسو مانئے، تین سو، چار سو...... پانچ سو مان لیجئے......''

دوسرے کا انداز بھی ٹالنے والا تھا۔

''آپ لوگ جس انداز میں باتیں کر رہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔ اصل میں آپ لوگ اس بات کی اہمیت کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں، پوری بات آپ پر کھل جائے گی تو آپ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے......''

پہلے نے انہیں سمجھایا۔ اس کی غیر معمولی سنجیدگی پر ان لوگوں کے کان کھڑے ہوئے۔ انہیں محسوس ہوا کہ بات اتنی ہلکی نہیں جتنی وہ سمجھ رہے تھے، دوسرے نے دریافت کیا۔

''چلئے دو تین سو مان لینے میں کچھ حرج نہیں، اتنے لوگ ہوں گے تناسب ملا کر......؟''

''اب یہ بتائیے کہ یہ تعداد ہماری آبادی کے کل کتنی فیصد ہوئی ـــ؟''

پہلے نے پوچھا۔ لوگوں نے اسے عجیب نگاہوں سے گھورا۔

''اب آپ اپنی بات کو کھول ہی ڈالئے، ہم خواہ مخواہ تذبذب میں پڑے ہیں......''

''بہت اچھی بات پوچھی آپ نے ......آپ کو شاید پتہ نہیں کہ اس دو تین سو آدمیوں کی نشست کا بہت شہرہ ہے۔ کچھ لوگ اسے ہماری پوری آبادی کا نمائندہ کہتے ہیں، یعنی وہاں جو کچھ ہوا، وہ پوری قوم کی ذہنیت کا غماز ہے......''

پہلے نے بات کھولنے کی کوشش کی۔

''یہ کیسے ممکن ہے ـــ؟ دو تین سو آدمیوں کو پوری قوم کا نمائندہ کیسے کہا جا سکتا ہے۔ اگر آبادی کے لحاظ سے تناسب نکالا جائے تو زیرو سے بھی کم آئے گا۔ اس قسم کی بات تو کوئی پاگل ہی کر سکتا ہے۔''

دوسرے نے سرے سے اسے مسترد کر دیا۔

تیسرے اور باقی لوگوں نے بھی حمایت میں سر ہلایا۔

پہلا مسکرایا، پھر فوراً سنجیدہ ہو کر بولا۔

''یہ تو آپ کہتے ہیں نا، میں بھی یہی کہتا ہوں ۔ پر ہم اور آپ کتنے لوگوں کو سمجھاتے پھریں گے۔ وہاں تو سب یہی کہتے ہیں، وہ پاگل ہیں سب تو پاگل نہیں......''

خاموشی چھا گئی، فوراً کوئی کچھ بول نہیں سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے نے بات نکالی۔

''سوال یہ ہے کہ اگر کوئی غلط بات کچھ لوگوں کے دل میں یقین بن کر بیٹھ جائے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے ___؟''

''غلط یقین کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کرنی چاہئے......''

پہلے نے فوراً جواب دیا۔

''تو پھر یہ کوشش ہم کیوں نہیں کرتے ___؟''

تیسرے نے پوچھا۔

یہ سوال ہمیں اپنے آپ سے کرنا چاہئے......''

پہلے نے جواب دینے میں تاخیر نہیں کی۔

پھر خاموشی......کچھ وقفے کے بعد تیسرا بولا۔

'' چلئے آپ ہی بتا دیجئے۔ ہم سمجھ لیں گے کہ آپ جو کچھ کہیں گے وہ ہمارے ہی دل کی آواز ہوگی۔ آپ سے پوچھنا گویا اپنے آپ سے پوچھنا ہے ___''

پہلے کے چہرے پر قدرے سرخی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس نے سب کے چہروں پر باری باری نگاہیں ڈالیں، پھر اعتماد بھرے لہجے میں پوچھا۔

'' اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر سچ بتائیے کہ یہ جو واقعہ ہوا، کیا صحیح تھا ___؟''

خاموشی پھر درمیان آ گئی۔ اس دفعہ اس کا وقفہ طویل ہو گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے تمام لوگوں کے اندر زبردست ہلچل مچی ہو۔ ایک غبار سا ان کے اندر اٹھا ہوا تھا اور وہ اس پر

قابو پانے کی زبردست کوشش کر رہے تھے۔
کافی دیر کے بعد وہ اپنے اندر کی ہلچل پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکے۔ دوسرے نے آہستہ سے کہا۔
''اس میں شک نہیں کہ یہ واقعہ بہت افسوسناک تھا، بلکہ قابل مذمت بھی ــــ ''
''آخر ہم بھی تو اس کی خوبصورتی سے فائدہ اٹھاتے تھے، جب بھی اپنے گھروں میں گھٹن محسوس ہوتی، ہم اس خوبصورت جگہ پر نکل آتے، ہری بھری دوب کے اندر سرسراتی ہوئی ہوا سے لطف اندوز ہوتے، جھرنوں کی پھواروں سے ہماری اندر کی گرمی دور ہو جاتی، ہمارے بچے کھلی فضا میں دوڑ لگاتے، اچھلتے کودتے، ہمیں محسوس ہوتا کہ ہمیں جنت کا ایک ٹکڑا میسر آ گیا......''
تیسرا خاصا جذباتی ہو گیا۔
''پھر عام تاثر کیوں ہے کہ ہم اس کی بربادی سے خوش ہیں ــــ ؟''
پہلے نے پھر ایک سوال ان کے چہروں پر اچھال دیا۔
''تو ہمارے دشمنوں کو سازش ہے......''
بیک وقت کئی آوازیں اٹھیں۔
''آپ کا کہنا صحیح ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم اپنی حرکتوں سے اپنے دشمنوں کو طاقت فراہم کر رہے ہیں۔''
پہلے نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔
سب اس کا منہ تکنے لگے۔

''اس کا واحد حل یہ ہے کہ ہم ملزموں کو پکڑ کر ان کے حوالے کر دیں۔''
آواز میں غصہ کا عنصر غالب تھا۔ یہ ایک بڑی نشست تھی۔ جو باقاعدہ طلب کی گئی تھی بند

کمرے میں۔

''اس میں حرج بھی کیا ہے۔ جب ہم نے تعاون کا وعدہ کیا ہے تو پھر یہ تو کرنا ہی ہوگا......''

دوسری آواز جو قدرے ٹھنڈی تھی۔

''لیکن اس کا مطلب یہ بھی تو نکلے گا کہ ہم نے اس بات کو تسلیم کرلیا ہے کہ حملہ آور ہمارے اندر کا ہے......''

تیسری آواز جو پہلی سے ملتی جلتی تھی۔

''ہمارے تسلیم کرنے نہ کرنے سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔ وہ کہتے ہیں، دنیا کہتی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ کوئی بھی ہمیں بے قصور سمجھنے کو تیار نہیں، جس انداز سے ہم اپنی صفائی دے رہے ہیں، اس سے اور زیادہ شک کے گھیرے میں آتے ہیں......''

یہ چوتھی آواز تھی جو پہلی آوازوں سے بالکل مختلف تھی۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی، تب سوچ میں ڈوبی ہوئی پانچویں آواز ابھری۔

''مجھے پتہ نہیں کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اچانک سامنے نہیں آیا، بلکہ شاید بہت دنوں سے اور بہت دور سے ہمیں گھیرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں جس میں بالآخر وہ کامیاب ہوگئے......''

چند لمحوں کے لئے خاموشی کی چادر پھرتن گئی۔ ان کے چہروں کے تاثر بتا رہے تھے کہ پانچویں آواز کو ماننے یا نہ ماننے کی ان کے اندر ایک زبردست جنگ چل رہی ہے جس میں فوراً کسی کا کامیاب ہونا آسان نہیں تھا۔

کچھ دیر کے بعد پھر ایک آواز ابھری۔

''اس بات کی اگر صحیح ڈھنگ سے وضاحت کردی جائے تو ہمیں سمجھنے میں بہت آسانی ہو......''

''بھئی یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ ہمارے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ ہم اپنے معاملے میں بڑے کٹر ہیں۔ ہم دہشت گردی کی تعلیم دیتے ہیں......''

ابھی بات شاید مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ محفل میں دبی دبی سی ہنسی...... یہ چیز کچھ لوگوں کے برداشت سے باہر بھی ہوگئی اور باقاعدہ ہنسی کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

''کیوں بھائی — آپ ہنسے کیوں — ؟''

حیرانی کا پوز کرتا ہوا سوال تھا لیکن شاید جواب معلوم تھا، اس لئے اس میں کوئی زور نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا اور وہ بدستور مشغول رہے...... یعنی ہنسنے ہنسانے میں۔

اس نے جواب کے انتظار میں کچھ دیر توقف کیا، مگر اپنی جھینپ مٹانے ہٹاتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔

''میں جانتا ہوں، آپ بھی جانتے ہیں، ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ مذاق کی حد تک تو یہ صحیح ہوسکتا ہے مگر حقیقت سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں۔ پھر بھی یہ چیز ہمارے سر آتی ہے، یہ تاثر ہمارے سلسلے میں پیدا کیا گیا ہے تو ہمیں بھی اپنی پوزیشن واضح کرنی چاہئے......''

''یعنی ایک غلط مقدمے کے فریق بنکر ہم اپنے مخالف کے موقف کو اور مضبوط کریں......؟''

یہ ایک غصیلی آواز تھی جس نے ایک اضطراب آمیز خاموشی طاری کردی۔

''تو پھر......؟ تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے — ؟''

لوگوں کا موڈ دیکھ کر پہلی آواز نے دھیرے سے ایک پانسا پھینکا۔

''سوال یہ ہے کہ اگر انہوں نے ہمارے سلسلے میں ایک غلط تاثر پیدا کرلیا ہے تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم ان کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے اپنا وقت ضائع کریں......''

یہ وہی غصیلی آواز تھی جو کم وبیش اچانک سارے لوگوں کی آواز بن گئی تھی کیوں کہ کسی نے ابھی تک اس کی بات کاٹی نہیں تھی۔ پہلی آواز ایک لمحے کے لئے رکی، پھر ابھری۔

''ارے بھائی، یہ تو سوچو کہ ان کا تاثر ہر لحہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جائے گا اور یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا جائے گا۔ ایک وقت وہ آئے گا جب ان کا یہ تاثر ایک کامل یقین میں

بدل جائے گا، یعنی ایک زندہ جھوٹ ایک جاوداں سچ میں یوں تبدیل ہو جائے گا کہ ہم چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکیں گے......''

''محض اتفاق تھا یا کہنے کا ایک خاص انداز یا وہ لمحہ شاید کسی خاص تاثر سے لبریز تھا کہ بات لوگوں کی سمجھ میں فوراً آ گئی۔

آگے جو سوال آیا وہ کافی دیر کے بعد۔ اس میں کسی قسم کا کوئی تیکھا پن بھی نہیں تھا۔

''آپ کے ذہن میں کوئی بات ہو تو بتائیے......''

''ہمیں فوراً اپنے دروازے، کھڑکیاں، روزن، دریچے......کھول دینے چاہئیں، صرف یہی طریقہ ہے اپنی صفائی دینے کا......''

آواز نے دوٹوک اپنا فیصلہ سنایا۔ ایک بھنبھناہٹ سی پیدا ہوئی، پھر ایک کاٹ کی کوشش......

''دوسروں کو خوش کرنے، ان کی بیجا غلط فہمیوں کو دور کرنے کیلئے اپنے سارے دروازوں کو آشکارا کر دینا کوئی عقلمندی ہوگی کیا ــــ؟''

''اس پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں، بس اتنا سمجھ لیجئے کہ اب ہم اپنے دروازوں کی حفاظت بھی نہیں کر سکیں گے۔ ان کے پاس ہمیں اندر سے روند ڈالنے کے منصوبے ہیں، اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم خود......''

بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک خلفشار کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ جو لوگ ابھی تک اس کی بات سکون کے ساتھ سن رہے تھے اور گاہے گاہے اثبات میں سر ہلا رہے تھے، اچانک مشتعل ہو گئے اور اپنی اپنی بولی بولنے لگے۔ کسی کی آواز سمجھ میں نہ آتی تھی۔

دیر تک یہی کیفیت بنی رہی تو ایک تیز آواز ابھری جو شاید سب کی نمائندگی کر رہی تھی۔

''آپ تو ہمیں بزدلی کا سبق پڑھا رہے ہیں صاحب۔ اس ڈر سے کہ حملہ آور آئیں گے، ہمیں برباد کریں گے، ہم اپنے گھروں کے دروازے ان کے لئے کھول دیں اور ان سے درخواست کریں کہ وہ جس طرح چاہیں ہمیں اور ہمارے گھروں کو روند ڈالیں''

اس قدر تیز آواز تھی کہ اس کا فوری طور پر جواب دینا بھی آسان نہیں تھا۔ تیز آواز کا سب سے بڑا گن یہی تو ہوتا ہے کہ وہ سب پر چھا جاتی ہے اور دیر تک کسی دوسری آواز کو ابھرنے نہیں دیتی۔ یہی ہوا۔ دیر تک کوئی آواز نہیں ابھری، جو آواز اس کا جواب دے سکتی تھی وہ بھی منتظر رہی کہ اس کی تیزی میں کچھ کمی ہو تو......

آوازوں کی سطح بلند سے بلندتر ہوتی گئی، وہاں موجود تقریباً سبھی لوگوں نے اس بلندی میں شامل ہونا ضروری سمجھا تو پھر بالکل فطری انداز میں اتار کا عمل بھی شروع ہوا۔ ایک خاص سطح پر آکر یہ چیز رک گئی تو پہلی آواز نے، پیلے پن کے ارتعاش کے ساتھ اپنا گلا صاف کیا۔

''آپ لوگ میری بات سمجھے نہیں، ہمارے ہاں یہ عجیب بات ہے کہ آوازوں کے بلند آہنگ شور میں صحیح آواز بالکل دب جاتی ہے......سنی بھی جاتی ہے تو اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی، صفائی اور کھرا پن ہمارے کانوں کو زیب نہیں دیتا۔ اس سلسلے میں ہمارے اندر ایک خاص قسم کا تعصب فوراً جنم لے لیتا ہے اور اسے آناً فاناً فروغ بھی مل جاتا ہے......''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں —— ؟''

بہت تیز تو نہیں، نسبتاً ایک تیز آواز نے اس کی تقریر درمیان ہی میں کاٹ دی۔ مگر صاف ظاہر تھا کہ ماحول پہلے جیسا تیز و تند نہیں رہا تھا۔ لوگ تیکھے پن کے ساتھ سہی، کچھ سننے کے موڈ میں ضرور تھے۔

''بھائی! پہلے آپ اپنے دلوں سے کھرچ کھرچ کر اس بات کو نکال دیجئے کہ میں آپ کا دشمن ہوں یا کسی طرف سے آپ کے ہاں Plant کیا گیا ہوں یا آپ کو گمراہ کرنے یا بزدل بنانے کے کام پر مامور کیا گیا ہوں......لعنت بھیجئے، دراصل میں اپنی سمجھ کے مطابق جس بات کو سچ سمجھتا ہوں، اسے آپ تک پہنچا دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ یقین مانئے، میری طرح اور بھی بہت سے لوگ آپ کے درمیان ہیں، لیکن وہ آپ کے رویے

اور ردعمل سے خوف کھا کر خاموشی کو راہ دیتے ہیں۔ خدارا آپ بات سننے کی عادت تو ڈالئے۔ کم سے کم ہماری آپ کی سوچی ہوئی بات آپ کے کانوں تک تو پہنچ جائے، اس کے بعد صحیح غلط کا فیصلہ کرنے کی کوشش کریں......"

آواز ایک لمحہ کے لئے رکی، اس نے شاید ردعمل دیکھنے کی کوشش کی۔ سب کے چہروں پر مختلف تاثرات تھے، ایک ہی تاثر کہیں نہیں تھا۔ اس سے اس کو ایک گونا اطمینان نصیب ہوا۔ گویا ابھی وہ آگے اپنی بات رکھ سکتا تھا۔

"میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ ہم بزدل بن جائیں یا ڈر جائیں......نہیں جناب، یہ دونوں چیزیں ہمارے کیرکٹر ہی میں شامل نہیں ہیں۔ اس طرح تو ہماری پہچان ہی ختم ہو جائے گی اور ہم کسی قیمت پر نہیں چاہیں گے کہ ہماری پہچان ختم ہو۔ ہونے کا مطلب اپنے آپ کو ان کے سامنے ننگا کر دینا یا دنیا کے سامنے اپنے سارے رازوں کو آشکارہ کر دینا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے بدخواہوں کے ذہن میں ہمارے بارے میں جو غلط فہمیاں بیٹھ گئی ہیں، انہیں کسی طرح دور کرنا ہے۔ یہ اسلئے بھی ضروری ہے کہ جس جھوٹ کو انہوں نے اپنے گلے سے لگایا ہے، وہ جھوٹ ان کی اگلی نسلوں تک سچ نہیں بن جائے، پکا سچ......"

لوگ چپ رہے۔ اس کا مطلب تھا لوگ اس کی بات کی صداقت پر ایمان لے آئے ہیں۔ سو فیصد نہ سہی، ان کی اکثریت نے اسے ضرور قبول کر لیا ہے۔ بارے جو آواز آئی اس سے بھی یہی ظاہر ہوا۔

"آخر کس طرح ہم ایسا کر سکیں گے......؟"

اس آواز کو درمیان ہی میں اچک لیا گیا۔

"سب سے پہلے تو ہمیں اپنے ذہنوں سے شک وشبہات کے جالے کو صاف کرنا ہوگا۔ جب ہم اپنے اندر باہر کو شیشے کی طرح چمکا دیں گے تو اس کی شعاعیں دوسروں تک بھی یقیناً پہنچیں گی اور ہمارے اندر بھی اعتماد پیدا ہوگا......"

حالانکہ بات واضح نہیں تھی لیکن ان میں سے کچھ لوگ 'لبیک' کہنے کے انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

باہر سے قطعی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اندر ایک وسیع عمارت ہے۔ زمین بہت پھیلی ہوئی تھی اور عمارت کی تعمیر اس ڈھنگ سے کی گئی تھی کہ تقریباً ساری زمینیں استعمال ہو گئی تھیں۔ جدید ترین تعمیر کے اس زریں اصول کو استعمال نہیں کیا گیا تھا جس میں تعمیر زمین سے اٹھ کر سیدھے آسمان پر چلی جاتی ہے۔ موجودہ تعمیر سے پھیلنے کا احساس ہوتا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی ایک بڑا سا صحن ملتا تھا جس کے ایک طرف قطار سے غسل خانے اور Toilet بنے ہوئے تھے۔ چاروں طرف ہری بھری گھاس تھی اور جا بجا خوشنما پھولوں کی کیاریاں۔ اس وقت شاید مکینوں کے نہانے دھونے کا وقت تھا۔ غسل خانوں میں خاصی چہل پہل تھی۔ کچھ اندر تھے، زیادہ باہر تھے۔ گھاس کے قطعوں پر دھوئے ہوئے کپڑے سوکھ رہے تھے۔ دوپہر سے کچھ قبل کا وقت تھا۔ چند اجنبی چہروں کو دیکھ کر سب کی نگاہیں اس طرف کو اٹھ گئیں۔ حالات کے پیش نظر ان کی نگاہوں میں بیشمار مبہم سوالات ابھر آئے تھے لیکن وہ انہیں نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

اونچی سیڑھیوں کے بعد ایک بڑا کمرہ تھا جس میں ایک طرف میز اور چند کرسیاں پڑی تھیں۔ باقی حصے میں چوکیوں کا فرش تھا جن پر سفید چاندنی بچھی تھی۔ فرش ہی پر تین چار جگہ لکڑی کے قلمدان رکھے تھے جن پر دبیز رجسٹر کھولے کچھ لوگ لکھنے پڑھنے میں مصروف تھے۔ انہیں دیکھ کر ایک صاحب تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور السلام وعلیکم کہتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ ایک ایک کر کے سب نے مصافحہ کیا، پھر انہوں نے کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے آنے کا مقصد دریافت کیا۔

سارے کا سارا ماحول آنے والوں کے لئے اجنبی تھا۔

مقصد ــــ؟

سچ یہاں آنے کا ان کا کوئی واضح مقصد تو تھا ہی نہیں۔ جب خود ان کے ہاتھوں میں یہ چیز نہیں تھی تو وہ ان کے ہاتھوں میں کیا تھماتے ــــ؟

پھر بھی جواب تو دینا ہی تھا اور فوراً۔

ان میں سے ایک نے صاف صاف کہہ دینا ہی مناسب سمجھا۔

''آج کل ہر طرف طرح طرح کے شبہات سر ابھار رہے ہیں، ہمارے پاس اپنی صفائی کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم سب کچھ جان لیں، تب ہمیں ان کا سامنا کرنے میں آسانی ہوگی......''

وہ صاحب بلکہ مولانا ایک خاص انداز سے مسکرائے۔

''آج کل تقریباً روزانہ لوگ کسی نہ کسی شکل میں یہاں آتے ہیں۔ ہمارے لئے فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ کون خلوص دل سے آتا ہے اور کون ہمیں تاراج کرنے کی نیت رکھتا ہے۔ بہر کیف! آپ آئے، بڑی خوشی کی بات ہے، آپ کا دلی خیر مقدم ہے۔ فرمائیے، آپ کو کون سی معلومات درکار ہیں......؟''

مولانا کے طنزیہ انداز کے ساتھ ساتھ پر خلوص جملوں سے وہ اندر اندر بڑے جز بز ہوئے لیکن وہ شاید اس کیمپس کے انچارج تھے، زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کیلئے ان سے دب کر گفتگو کرنا ہی مناسب تھا۔ ایک نے ان سے صاف لفظوں میں پوچھا۔

''سب سے پہلے تو یہ بتائیے مولانا کہ اتنا بڑا کیمپس چلانے کے لئے آپ کے پاس فنڈ کہاں سے آتا ہے ــــ؟''

مولانا کو بھی شاید یہ صاف گوئی پسند آئی۔ انہوں نے اپنا ایک پہلو بدلا اور ایک معاون کو رجسٹر لانے کی ہدایت کرتے ہوئے بولے۔

''بہت اچھا سوال کیا آپ نے۔ قوم کو یہ جاننے کا پورا حق ہے بلکہ جاننے کی کوشش نہیں

کرنا افسوسناک ہے۔ ہمارے فنڈ کے آنے کا کوئی ایک راستہ متعین نہیں ہے۔ ہم ہر سال اپنے معتمد سفیروں کو رسید اور دوسرے کاغذات کے ساتھ ملک کے طول وعرض میں روانہ کرتے ہیں تاکہ وہ مخیّر لوگوں سے رابطہ قائم کر کے چندے کی رقوم جمع کریں۔ اس کے علاوہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر چرم کے پیسے بھی آتے ہیں، زکوٰۃ کے پیسوں کا ہمارے ہاں ایک علیحدہ اکاؤنٹ ہے، اس مد میں بھی کافی پیسے آجاتے ہیں۔"

"زکوٰۃ کے پیسے تو سب کے لئے جائز نہیں — ؟"

ایک نے درمیان میں بات کاٹی۔

"بھائی ہماری قوم کی بدنصیبی ہے کہ مدرسوں میں خوش حال گھروں کے بچے نہیں آتے۔ وہ جو یتیم، بے سہارا ہوتے ہیں، ہر طرح سے نادار ہوتے ہیں، جن کے گھروں میں ہفتوں چولہے نہیں جلتے، کیا ایسے بچے زکوٰۃ کے مستحق نہیں......؟"

مولانا الثاان سے پوچھ بیٹھے۔ اس کا ان کے پاس کیا جواب ہوسکتا تھا۔

مولانا نے کچھ دیر ان کے جواب کا انتظار کیا، پھر خود ہی بول اٹھے۔

"ویسے آپ رجسٹر دیکھ کر اطمینان کر سکتے ہیں۔ ہم زکوٰۃ کے پیسے انہیں پر صرف کرتے ہیں جو مذہبی اور اخلاقی طور پر اس کے مستحق ہوتے ہیں۔ اس میں ہم سختی برتتے ہیں......"

"آپ کے ہاں باہر سے بھی تو پیسے آتے ہیں — ؟"

سوال تیکھا تھا، لیکن مولانا کے چہرے پر کوئی رنگ نہیں آیا۔ انہوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

"جی ہاں، باہر سے بھی پیسے آتے ہیں۔ انکے بھی دو مد ہیں، ایک چندہ، دوسرا زکوٰۃ......"

"مگر مولانا، اتنی دور بیٹھ کر آپ کیسے جان سکتے ہیں کہ کون پیسے زکوٰۃ کے ہیں اور کون پیسے ......عام تاثر، تو یہی ہے کہ باہر سے آنے والے سارے پیسے زکوٰۃ کے ہوتے ہیں......"

سوال فوری تھا، جواب بھی فوراً ملا۔

''یہ تو دینے والے کے ایمان اور اس کی صواب دید پر ہے، جو گناہ ثواب ہوگا، وہ انہیں کی گردن پر......''

''مولانا یہ تو بتائیے باہر کے پیسے آپ کے یہاں اس دھڑلے سے آتے کیسے ہیں......؟''

سوالوں کے جنگل میں شاید سب سے اہم سوال یہی تھا۔ غالباً اسی سے سارے سوال اور سارے اشکال جڑے ہوئے تھے۔

مولانا شرعی انداز میں ترشی ہوئی اپنی مونچھوں میں مسکرائے اور گویا ہنستے ہوئے بولے۔

''اصل بات پر تو آپ اب آئے ہیں حضور، جو آتے ہیں ان سب کے دلوں میں یا زبانوں پر یہی ایک سوال ہوتا ہے جو مختلف صورتوں میں سامنے آتا ہے۔ آپ نے اچھا کیا کہ زیادہ چکر نہیں کاٹے اور مقصد پر جلد آگئے۔ مگر بھائی میرا آپ سے اور تمام لوگوں سے کہنا ہے کہ سوال کرنے سے پہلے آپ مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے رابطہ کیوں قائم نہیں کر لیتے اور تمام متعلقہ فائلوں کا مطالعہ کیوں نہیں کر لیتے —— ؟ بھائی میرے، یہ سارے پیسے جائز طریقوں سے، سرکاری ضوابط کا سختی سے لحاظ رکھتے ہوئے یہاں آتے ہیں۔ ہم ان کی آمد و خرچ کا پورا حساب رکھتے ہیں۔ آپ چاہیں تو ان کاغذات کا غائر مطالعہ فرمالیں، چاہیں تو حسابیات کے کسی ماہر سے جانچ کروالیں، چاہیں تو......''

''وہ سب تو ٹھیک ہے مولانا لیکن اس تاثر کو کیا کیجئے گا کہ یہ پیسے دہشت گردی کے فروغ میں استعمال ہوتے ہیں......؟''

''یہ تو ہم پر نہیں، ہماری سرکار پر ایک گھناؤ الزام ہے۔ ہمارے سارے خرچے کی audit ہوتی ہے، باقاعدہ جانچ ہوتی ہے، اس کے بعد بھی کسی کے دماغ میں شک و شبہ کی کچھ غلاظت رہ جاتی ہے تو اس کے لئے سی بی آئی ہے، سی آئی ڈی ہے، سرکار کی دوسری ایجنسیاں ہیں۔ چند گمراہ، داڑھی والے، لمبے کرتے والے مسلمان ان حرکتوں میں ملوث پائے گئے، اس لئے کروڑوں افراد کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا جائے، یہ کہاں کا انصاف

ہے بھائی......؟"

مولانا کو بولتے بولتے اور اپنی صفائی دیتے دیتے خاص مہارت ہوگئی تھی۔ وہ کسی اتار چڑھاؤ کے بغیر بے تکان بول رہے تھے۔ شاید انہیں دن بھر کئی بار ان باتوں کو دہرانا پڑتا تھا، نہ تو ان کی آواز تیز ہوئی، نہ چہرہ تمتمایا، نہ آنکھوں سے ہلکی سی چنگاری نکلی۔ وہ سب بہت غور سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ انہیں چیزوں کا غائر مطالعہ کرنے تو وہ یہاں آئے تھے۔

"چلیئے مولانا، ہم نے آپ کی بات سن لی، ہم بعد میں طے کریں گے کہ آپ کی بات میں کہاں تک دم ہے۔ لیکن آپ یہ بتایئے کہ کیا واقعی آپ کے نصاب میں کچھ ایسی چیزیں شامل ہیں جو دل دماغ کو دہشت گردی کی طرف مائل کرتی ہیں......؟"

ان میں سے ایک نے بے تکلفی سے پوچھا۔ مولانا مسکرائے، پھر کھل کر ہنسے، دیر تک ہنستے رہے۔ وہ سب انہیں چپ چاپ دیکھتے رہے۔ مولانا جی بھر کے ہنس چکے تو ان سے مخاطب ہوئے۔

"آپ نے مدرسوں میں پڑھے ہوئے کسی طالب علم کو بڑا ڈاکٹر، بڑا انجینئر، بڑا آفیسر، بڑا تاجر، بڑا وکیل، بڑا پروفیسر بنتے دیکھا ہے — ؟

خوب سوچ کر جواب دیجئے۔ آپکے جواب میں ہی آپکے سوال کا جواب پوشیدہ ہے۔

وہ سوچتے رہے، بہت دیر تک سوچتے رہے۔ انہیں یاد نہیں آیا کہ انہوں نے ایسا کچھ سنا یا دیکھا ہے۔ مولانا نے جن منصوبوں کے نام لئے، وہ تو پبلک اسکول اور اعلیٰ مشینری کالجوں میں پڑھنے والے ہوتے ہیں۔ زیادہ سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

انہیں مولانا سے اپنے سوال کا جواب بھی چاہیئے تھا جس کا بظاہر کوئی تعلق انہیں اس سوال سے نظر نہیں آتا تھا۔

"نہیں...... مولانا، ہمیں تو یاد نہیں آتا......"

ایک نے قدرے بیزاری سے جواب دیا۔

''نہیں یاد آیا نا...... میں جانتا تھا آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا، کسی نے نہیں دیکھا ہے، ہاں مسجدوں میں امامت، مؤذن کی ڈیوٹی زیادہ پڑھ لکھ گئے تو مدرسوں میں مدرسی ...... یہ تو سماج کے کمزور ترین طبقے کے لوگ ہوتے ہیں، یہ دہشت گردی کیا جانیں......''

''تو پھر مولانا یہ بتائیے جس سماج میں یہ لوگ بہت کارآمد نہیں تو پھر ایسی تعلیم کا فائدہ......؟''

ایک نے مولانا کی بات درمیان میں کاٹ کر دریافت کیا۔

مولانا اپنی بات ادھوری رہ جانے پر جزبز تو ہوئے مگر انہیں پھر ایک تقریر کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔

''اچھا سوال کیا آپ نے، اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو ہمارے ہاں دینی تعلیم فرض ہے، مدرسے نہ ہوں تو یہ سلسلہ رک جائے۔ اسکول کے جدید نصاب میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی بلکہ اقلیتی طبقے کے جو انگریزی اسکول ہوتے ہیں، وہاں بھی دینی تعلیم نہیں ہوتی۔ پھر ہماری مسجدیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ امام اور مؤذن کی جگہوں پر انگریزی پڑھا لکھا، زیادہ پیسے مانگنے والا آدمی تو آنہیں سکتا۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں نادار اور بے سہارا بچوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے، یہاں بہت کم پیسوں میں اور بعض اوقات بالکل مفت تعلیم ملتی ہے۔ مدرسے نہ ہوں تو ہمارے سماج کا ایک بہت بڑا طبقہ بالکل جاہل رہ جائے گا اور سماج پر بہت بڑا بوجھ بن جائے گا۔ دینی تعلیم انہیں کم سے کم برائیوں کی طرف جانے سے تو روک دیتی ہے۔ مدرسوں کے فارغ سماج پر ہرگز بوجھ نہیں ہوتے بلکہ بہت ہلکے پھلکے ہوتے ہیں......''

مولانا اپنے طور پر اپنے موقف کی پوری وکالت فرما رہے تھے، یہ اور بات تھی کہ ان کا مخاطب ان کی دلیلوں سے قائل ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یوں اس وقت جو لوگ آئے تھے، وہ خود ہی کسی بحث کے موڈ میں نہیں تھے، وہ تو صرف معلومات حاصل کرنے آئے تھے اس لئے مجبوراً انہیں اس سلسلے میں کچھ 'بحث نما' سوال کرنے پر مجبور ہونا پڑ رہا تھا۔

ان میں سے ایک نے کہا۔

''مولانا، ہر سال اتنی بڑی تعداد آپ کے ہاں سے نکلتی ہے تو زور صرف اس بات پر نہیں ہونا چاہئے نا کہ یہ لوگ سماج پر اپنا بوجھ نہیں ڈالتے، ہلکے پھلکے ہوتے ہیں، لیکن صرف ہلکے پھلکے کیوں — ؟ انہیں سماج کے لئے زیادہ سے زیادہ کارآمد بھی تو ہونا چاہئے''

مولانا نے اس کی طرف غور سے دیکھا، ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سب پر ڈالی اور اپنے روایتی متین لب و لہجے میں دریافت کیا۔

''میں نے تو جو عرض کرنا تھا، کر دیا۔ میرا یقین ہے کہ ہمارے فارغ التحصیل سماج کے لئے نقصاندہ نہیں بلکہ کارآمد ہوتے ہیں، آپ ہی بتا دیجئے آپ کے ذہن میں اس کا کیا نقشہ ہے — ؟''

''انہیں جدید تعلیم سے بھی تو آراستہ ہونا چاہئے، دینی تعلیم اپنی جگہ مقدم، لیکن اس کی بنیاد پر وہ صرف اپنی قوم یا محض اپنی عاقبت ہی کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے، پورے سماج کے لئے تو نہیں — ؟

لہجہ پر سکون تھا۔ مولانا نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی۔

''ہم نے انہیں دنیاوی یا جدید تعلیم حاصل کرنے سے منع تو نہیں کیا، جن کو مواقع حاصل ہیں، وہ ایسا کر بھی رہے ہیں، لیکن یہ چیز ہمارے بس کی نہیں ہے۔ کچھ جگہوں پر اس کے لئے کوششیں بھی ہو رہی ہیں۔ ہم نے بھی اپنے نصاب میں ابتدائی مرحلے پر جدید علوم کی گنجائش رکھی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک ہی ادارہ سارے فرائض انجام نہیں دے سکتا۔ ہم تو سینکڑوں برس سے ایسے ادارے چلا رہے ہیں، اس نوعیت کا اعتراض ہم پر کبھی نہیں ہوا، ادارے اور بھی ہیں جن سے توقعات رکھنی چاہئے......''

مولانا کے جواب سے انہیں جو جانکاری مل رہی تھی، ان کے لئے یہی بہت تھا۔ وہ ان کے جواب سے بدحظ نہیں ہوئے۔ ان میں سے ایک نے پھر پوچھا۔

''مولانا، ایک سوال کا جواب اور دے دیجئے۔ ہمیں یہ جو حکم ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے تمہیں چین کا سفر بھی اختیار کرنا پڑے تو اس سے دریغ نہ کرو۔ جس وقت یہ حکم صادر ہوا، اس وقت چین کا سفر عرب سے بہت طویل تھا، مہینوں کی مسافت کے بعد آدمی منزل پر پہنچتا تھا، پھر جس تعلیم کا حکم دیا گیا تھا، اس کی نوعیت مذہبی تو ہو گی نہیں، کیوں کہ دینی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز تو وہی مقام تھا جہاں سے یہ حکم جاری ہوا تھا، ہمارے رسولؐ بہ نفس نفیس وہاں موجود تھے، تو یہ بتائیے کہ آج اس حکم کی کیا صورت ہے کیوں کہ یہ احکامات تو قیامت تک رہیں گے، ان میں سر مو تبدیلی نہیں آ سکتی۔

مولانا کے چہرے کا رنگ قدرے متغیر ہو گیا، مگر آدمی دنیا دیکھے ہوئے تھے، فوراً اپنے آپ پر قابو پالیا، بولے۔

''آپ صحیح فرما رہے ہیں، ہمارے ہاں دینی تعلیم کے ساتھ دنیاوی تعلیم کی بھی بہت اہمیت ہے۔ آپ غور فرمائیے، آج سے سات آٹھ سو برس قبل سارے دنیاوی علوم پر کون لوگ چھائے ہوئے تھے۔ سائنس کی اکثر ایجاد ہمارے ہاتھوں ہوئی۔ اصل بات یہ ہے کہ جس کو یہ مواقع حاصل ہیں، اس کے لئے تو یہ فرض ہے اور جس کو نہیں ہیں، اس کو کوشش کرتے رہنا چاہیے، لیکن ہمارا ارادہ تو غریبوں، ناداروں کے لئے ہے جو......''

''آپ کی باتوں سے تو ایک اور نکتہ یہ اجاگر ہو گیا، بلکہ شاید ایک نہایت سنجیدہ سوال کی صورت میں ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا کہ واقعی اس کی کیا وجہ ہے کہ پچھلے چھ سات سو برسوں میں ہم نے سائنس، طب اور دوسرے علوم میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا۔ ہمارا جو کچھ سرمایہ ہے، وہ بس چھ سات سو برس پہلے کا ماضی ہے جب کہ آج مواقع پہلے سے یقیناً زیادہ ہیں۔ ترقی کی راہ پر کوئی دوڑنا چاہے تو اس کے لئے کہیں کوئی رکاوٹ بھی نہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ترقی کی دوڑ میں اس قدر پیچھے رہ گئے......؟''

مولانا نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا، کچھ سوچ کر سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”آپ کا سوال تو اہم ہے لیکن اس کا حتمی جواب میرے جیسا معمولی آدمی نہیں دے سکتا۔اس کے لئے قوم کے صاحب الرائے افراد کو سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا اور بہت گہرائی میں جا کر اس کا جواب ڈھونڈنا ہوگا......“

”میری ناقص عقل نے اس سلسلے میں ایک بات سوچی ہے جو شاید اس ٹیڑھے سوال کا کسی حد تک جواب ہو......“

اس نے سب کی طرف یوں دیکھا جیسے اپنی بات کہنے کی اجازت طلب کر رہا ہو۔مولانا بہت لہک کر بولے۔

”ضرور،ضرور آپ تو خود ایک صاحب الرائے ہیں۔آپکی بات یقیناً قابل غور ہوگی......“

”میں سمجھتا ہوں،سرسید کے فارمولے کو ہم نے یکسر بھلا دیا،یہ ایک بڑی وجہ ہے،دوسری بات یہ ہے کہ ہم مزاجاً ماضی پرست ہیں۔ہمیں اپنے ماضی میں بہت کشش محسوس ہوتی ہے اور ہم اسی میں مگن رہتے ہیں۔جب کہ ماضی وہ تیز روشنی ہوتی ہے جو مستقبل کی نامعلوم راہوں کو روشن کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے،ورنہ تاریکی طاری کر دینا بھی اس کی خصوصیت ہے۔ہم روشنی سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے تو نقصان کس کا ہوگا......؟“

سب نے طالب علموں کی طرح اس کی باتیں سنیں......

یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر وہ کون لوگ تھے اور منتظم صاحب سے اتنی دیر تک کیا باتیں کرتے رہے......؟

ایک طالب علم نے بہت ہی گمبھیرتا سے،جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔مدرسے کے کچھ طلبا رات کے کھانے کے بعد صحن میں گھاس پر بیٹھے تھے۔

”اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے۔اس واقعہ کے بعد تو تقریباً روز ہی یہاں طرح طرح کے لوگ آرہے ہیں،ہوں گے یہ لوگ بھی......“

دوسرے نے لاپروائی سے جواب دیا۔ پہلے نے نیم تاریکی میں اسے گھورنے کی کوشش کی، چہرہ نظر تو آیا لیکن اس پر لکھی ہوئی تحریریں صاف نہیں تھیں۔ وہ بولا۔

''ان باتوں کو اتنے ہلکے پن سے مت لو بھائی، یہاں جو لوگ آرہے ہیں، ان میں کوئی بھی اپنا ہمدرد نہیں، سب اپنے اپنے طور پر ہماری جڑیں کھودتے ہیں، اس کا یقین جانو......''

''ویسے ہمارے منتظم صاحب اتنے ہوشیار ہیں کہ وہ یہاں سے کسی کو غیر مطمئن جانے نہیں دیتے......''

تیسرے طالب علم نے دخل دیا۔

''یہ بات ہم اور تم سوچتے ہیں نا، کون یہاں سے کیا تاثر لے کر جارہا ہے، یہ بات ہمیں کیا معلوم......''

پہلے نے جواب دیا۔

''اس کی فکر میں ہم دبلے ہوں — ؟ جس کا مسئلہ ہے، وہ سمجھے......''

چوتھے طالب علم نے لاپروائی سے کہا۔

''کمال کرتے ہو یار، یہ مسئلہ دوسروں سے زیادہ ہمارا ہے، دوسروں کے مقاصد کچھ اور ہوسکتے ہیں، ہمارا معاملہ تو زندگی اور موت کا ہے، تم محسوس نہیں کرتے کہ اس وقت سورج کی ساری تیز کرنوں کا رخ اچانک ہماری طرف ہوگیا ہے، صرف اور صرف ہماری طرف......''

پہلا کافی جذباتی ہوگیا۔ اس کے اس انداز پر وہ سب جو ابھی تک تفریح کے موڈ میں تھے، سنجیدہ ہوگئے۔

''تو آخر ہم اس میں کیا کریں — ؟''

''کچھ نہ بھی کریں تو کم سے کم اپنی آنکھیں اور کان تو کھلے رکھیں اور دماغ کی مشینوں کو ہر وقت چابی دیتے رہیں......''

پہلے طالب علم کا لہجہ فکرمندی سے بھرا ہوا تھا۔

''اس سے کیا ہوگا......؟''

پانچویں نے قدرے تمسخر کے ساتھ دریافت کیا۔ ابھی تک وہ سب کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا تھا۔

''اس سے کیا ہوگا......؟ مطلب اس سے......؟''

پہلا واقعی گڑبڑا گیا، پھر فوراً ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

''اس طرح کم سے کم یہ تو ہوگا کہ ہم اچانک گھیر نہیں لئے جائیں گے، اچانک مارے نہیں جائیں گے......''

آخر جملہ ادا کرتے کرتے اس میں ایک قسم کا اعتماد ابھر آیا۔ اس کے زیریں اثر کے تحت کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی، پھر ایک نئے طالب علم نے، جس کا نمبر شاید چھٹا تھا، بات چھیڑی۔

''ناظم صاحب بہت ہوشیاری اور خوبصورتی سے ساری بلاؤں کو ٹال دیتے ہیں، وہ جب تک یہاں ہیں، ہمیں زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں''

اس پر طالب علم نمبر ایک قدرے بھڑک اٹھا۔

بس، ہم اسی بات پر خوش ہوتے رہیں......؟ ناظم صاحب کی چرب زبانی پر نازاں ہونے کا صاف مطلب ہے کہ ہم شتر مرغ کی طرح رہتے ہیں منہ چھپا کر خوش ہو رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے اپنے آپ کو چھپا لیا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان کی چرب زبانی کا کہیں الٹا اثر نہیں ہو رہا ہو۔ انہیں شک تو ضرور ہوتا ہوگا کہ پڑھاتے ہیں مدرسے میں دینی کتب اور باتیں کرتے ہیں آسمان و زمین کی......''

''مطلب ــــ؟ ناظم صاحب کچھ غلط کہتے ہیں کیا ــــ؟''

دوسرے طالب علم نے ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کا رویہ ناظم صاحب کی کسی قدر حمایت کا تھا۔

''غلط نہیں کہتے لیکن لوگ ان کی بات پر سو فیصد یقین بھی تو نہیں کرتے......''

نمبر ایک کچھ ٹھنڈا ہوا۔

''تو انہیں یقین دلانے کے لئے ناظم صاحب کیا کریں — ؟ جان دے دیں......؟''

دوسرے کا لہجہ تلخ تھا۔

''مگر یار، ایک بات ہے......''

طالب علم نمبر تین نے گفتگو کو دوسرا موڑ دینے کی کوشش کی۔

''کیا — ؟''

''ناظم صاحب سو فیصد صحیح بات کہتے بھی نہیں......''

اس نے گویا ایک زبردست انکشاف کیا، حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس پر لوگوں کو جتنا چونکنا چاہئے تھا، نہیں چونکے، متجسس ضرور ہوئے۔ نمبر ایک نے دریافت کیا۔

''کیسے — ؟''

''بھئی ہم وہ وقت کیسے بھول سکتے ہیں جب ہم ٹولیوں میں بٹ کر گھر گھر کھانا کھانے جاتے تھے، فاتحہ سوم اور چالیسویں میں خاص طور پر مدعو کئے جاتے تھے، صدقہ کے بکرے ہمارے ہاں ذبح ہوتے تھے، فطرہ کے پیسے ہم پر جائز تھے......''

''تم تو یوں کہہ رہے ہو بھائی جیسے یہ سب ماضی کی داستانیں ہیں۔ بھیا میرے، یہ چیزیں تو ابھی بھی رائج ہیں۔ آخر ہمیں عید بقرعید میں جو پیسے ملتے ہیں وہ کہاں سے آتے ہیں۔ پرب تہوار، جمعرات، جمعہ کو بریانی کی دیگیں آتی ہیں اور میٹھے چاول کی پلیٹیں...... نچلے درجوں کے لڑکے تو آج بھی فاتحہ سوم اور چالیسویں میں جاتے ہیں......''

نمبر تین نے اپنے دل کی بھڑاس خوب نکالی۔ یوں یہ باتیں سب کو معلوم تھیں، پھر بھی وہ دوسروں کے منہ سے سنتے تو انہیں محسوس ہوتا جیسے کوئی ان کے زخموں پر مرہم رکھ رہا ہو۔

نمبر تین کے جانے مانے انکشافات پر سب کے سر عجیب انداز میں ہلنے لگے......

نمبر تین نے طنزیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا، بقیہ اس کے زبانی اظہار کے منتظر رہے جو اسی نے یوں کیا۔

''جائز......؟ ناجائز......؟ آپ کو پتہ ہے فاقے کے تین روز ہو جائیں تو حرام چیزیں بھی حلال ہو جاتی ہیں......''

اس بات پر کچھ لوگوں کے چہرے پر سوالیہ نشانات تن گئے۔ اس کا خمیر ناگواری سے تیار ہوا تھا۔ نمبر چار نے دریافت کیا۔

''تو یہ تین دن ہم پر کب گزرے......؟

''آج یہاں سے کھانا بند ہو جائے تو کل سے تین روز کا حساب لگالو......''

نمبر تین نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا۔

سب خاموش رہے۔ کسی سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

ویسے نمبر تین کسی کے جواب کا منتظر بھی نہیں تھا۔ وہ آگے بولا۔

''اور یہ جو مدرسوں کے سفیر چندوں کی اگائی کے لئے نکلتے ہیں، ان کا اپنا خرچ کہاں سے پورا ہوتا ہے، پتہ ہے آپ کو......؟''

کسی کو پتہ بھی ہوگا تو کسی نے فوراً نہیں بتایا۔ نمبر چار جو اس گفتگو میں ایک پارٹی بن گیا تھا، دھیرے سے بولا۔

''ہمیں کیا پتہ — ؟''

''چندے کا پچیس فیصد انہوں نے اپنی ذات کے لئے حلال قرار دے رکھا ہے......''

نمبر تین نے اطلاع دی۔ اس پر کسی نے تعجب یا کسی دوسرے تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ نمبر چار نے بے دلی سے پوچھا۔

''تو کیا اپنی ذات پر خرچ کرنا جائز نہیں — ؟''

''میں اس بحث میں نہیں پڑتا۔ آپ نے چونکہ ایک وسیع تناظر میں حرام حلال کی بات

نکال دی تھی، میں نے بھی اپنا ایک سوال جڑ دیا......''

نمبر تین بحث کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے کچھ اس انداز سے اپنی بات کہی کہ گفتگو کا یہ باب ہی بند ہو گیا۔

نمبر ایک اکتا کر بولا۔

''آخر ہم لوگ کیا باتیں کر رہے تھے ـــــ''

''باتیں ـــــ؟ باتیں کہاں، ہم تو آج کے واقعہ پر اظہار خیال کر رہے تھے بلکہ تشویش کا اظہار کر رہے تھے......''

''ہماری تشویش اور فکر مندی اپنی جگہ، مگر ہم باہر اپنی زبانیں بند ہی رکھیں تو بہتر ہے۔ ناظم صاحب ہم سے زیادہ عقل و سمجھ رکھتے ہیں۔ وہ اگر کچھ غلط بھی کہیں تو ہمیں ان کی حمایت کرنی چاہئے۔ ہر آدمی اپنی اپنی ڈفلی بجانے لگے گا تو مصیبت ہی آجائے گی......''

نمبر پانچ نے سنجیدگی سے انہیں سمجھایا۔

ابھی وہ شاید اور اپنے دل کی بھڑاس نکالتے کہ ورانڈے سے ناظم صاحب کی آواز آئی۔

''کیوں بھائی، ابھی سونے کا وقت نہیں ہوا ہے کیا ـــــ؟ یہیں رت جگا کرنے کا ارادہ ہے ـــــ؟''

سبھی ہڑ بڑا کر اٹھ گئے۔

یہ عقدہ کسی طرح کھل نہیں رہا تھا کہ مجسمہ پر حملہ آخر کس نے کیا، کیوں کیا ـــــ؟ اس ہرے بھرے پارک کو برباد کرنے کا منصوبہ کس ذہن کی پیداوار ہے؟

بظاہر سبھی اس کے حل کی تلاش میں سرگرداں تھے، مگر گہرائی سے مطالعہ کرنے والے ایک واقف کار کا کہنا تھا کہ اس سلسلے میں کوئی سنجیدہ نہیں تھا۔ اصل میں بربادی کی اس آگ پر سبھی اپنی اپنی روٹیاں سینک رہے تھے اور ظاہر یہ کیا جا رہا تھا کہ اس معاملے

میں انہیں جتنی فکر ہے، کسی اور کو نہیں۔

اس واقعہ کے تقریباً فوراً بعد سب لوگوں کے الگ الگ گروپ بن گئے تھے، سب کا دعویٰ غیر جانب داری کا تھا لیکن سب کا اپنا موقف تھا...... پوشیدہ......تہذیب کی یہ سب سے بڑی دین ہے۔

مجرم یا مجرموں کو پکڑنے کی واقعی کوشش کی جاتی تو شاید مجرم ہاتھ بھی آجاتے۔ دراصل اس واقعہ کو لوگوں نے اپنے اپنے طور پر خدائی مدد سمجھ لیا تھا اور برسہا برس سے دلوں میں پلنے والے اپنے خیالات کو وہ جس رخ پر موڑنا چاہتے تھے، انہیں سنہری موقع ہاتھ آگیا تھا۔

انہوں نے مجرم یا مجرموں کے خیالی مجسمے کا ماڈل تیار کر لیا تھا اور خیالی پڈسٹل پر اپنے اپنے ٹارگیٹ فٹ کرنے کی کوششوں میں زور شور سے لگے تھے۔

انہوں نے کچھ حقیقی، کچھ خیالی، کچھ تصوراتی اور کچھ دماغی اختراع سے اپنے اپنے ٹارگیٹ گروپ بنا لئے تھے۔ ٹارگیٹ گروپ بھی اپنی صفائی کے لئے جو حرکتیں کر رہے تھے، وہ بھی کم مضحکہ خیز نہیں تھیں۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ حملہ پوری طرح منصوبہ بند ہے اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے اسے انجام دیا گیا ہے۔

ایسے لوگ خال خال تھے، جو انسانی محنت اور قدرتی مناظر کے اس حسین ملے جلے سنگم کی بربادی پر واقعی غم زدہ تھے۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کا کوئی بہت بڑا ذاتی نقصان ہو گیا ہو۔ شہر میں یہی ایک جگہ تھی جہاں ہر طبقے اور مزاج کے لوگ اپنی گھٹن، مایوسی، ناکامی اور فرسٹریشن کے جنگل سے چھوٹ کر یہاں آتے اور کچھ دیر کے لئے اپنے دکھ درد بھول جاتے۔ کچھ دیر کا بھول جانا انہیں بہت راحت پہنچاتا تھا۔ وہ اسی راحت کی بدولت بہت دور اور بہت دور تک اپنے جانے انجانے اندرونی دشمنوں کو شکست دے پاتے تھے۔ وہ

صدق دل سے چاہتے تھے کہ مجرم پکڑے جائیں اور نہیں اپنے کے کیئے کی سزا ملے۔ان کے کیئے کی سزا دوسروں کو مل رہی تھی، اس سے وہ بہت بے چین تھے۔اس کوشش کو وہ نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے جو اس موقع کو غنیمت جان کر اپنے دل میں پالے ہوئے دشمن کو پھانسی دے رہا تھا۔

ساری باتیں اس کے سامنے تھیں۔

اپنے اندر جنم لیتے ہوئے اور پلتے ہوئے تمام شک وشبہات کو اس نے اپنے طور پر مٹانے کی کوشش کی تھی، جس کا اثر یقیناً اس کی خارجی زندگی پر بھی پڑا تھا۔

اسی لئے اس نے دوسروں کی نگاہیں اور کان اپنی نگاہوں اور کان کے ساتھ جوڑ دئے تھے، تا کہ جو اسے دکھائی دے، وہی دوسرے بھی دیکھیں، جن چیزوں پر اس کی نگاہیں پڑیں، ان پر دوسروں کی نگاہیں بھی مرکوز ہوں، جو بات اس کے کان سنیں، وہی بات دوسروں کے کان میں بھی پڑیں۔اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی حالات میں کوئی نمایاں تبدیلی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ان کی ہر قسم کی نقل وحرکت شک وشبہ کی نگاہوں سے دیکھی جارہی تھیں بلکہ شک کی گہری چادر چاروں طرف تن چکی تھی۔ان کی صفائی کو کوئی بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔یہ خیال جڑ پکڑ رہا تھا کہ وہ اپنے مبینہ قومی اور بین الاقوامی جرائم پر پردہ ڈالنے کی مہم میں لگے ہیں۔یہ یقین زمین میں گہرائی تک گڑا جا رہا تھا کہ مشرق سے مغرب تک وہ ایک ہی خیال اور ایک ہی مہم میں مصروف ہیں اور ان کا مقصد بس ایک ہے......

حالانکہ یہ ان کے لئے سب سے بڑا جھوٹ تھا۔اسی مبینہ اتحاد کو حاصل کرنے کے لئے تو وہ سینکڑوں سالوں سے کوشاں تھے۔یہ چیز انہیں آدھی بھی حاصل ہو جاتی تو شاید انہیں صفائیاں دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔یہ سوچ کر کبھی کبھی انہیں طمانیت بھی محسوس ہوتی کہ انہیں ایک سمجھا جارہا ہے۔انہیں یہ موہوم سی امید بندھ جاتی کہ شاید اس جھوٹ کو اتنی

بار دہرایا جائے کہ وہ بالآخر سچ بن جائے۔ انہیں اپنے مبینہ اتحاد کے بارے میں سن سن کر اندر سے بہت خوشی ہوتی مگر باہر سے وہ انکار کرنے پر مجبور تھے۔ ایک عجیب گڈمڈ سی صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ پس منظر میں وہ سوفیصد گھاٹے ہی میں نظر آتے تھے۔ فی الحال ان کا سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ موجودہ صورت حال میں وہ اپنے آپ کو کس طرح ایڈجسٹ کریں۔ ان کا گراف، اس قدر گر گیا تھا کہ سامنے کے منظر میں صحیح طور پر نظر بھی نہیں آتے تھے۔ یوں وہ بہت دنوں سے اپنے گراف کو گرتے ہوئے دیکھ رہے تھے، گرنے میں کبھی سست رفتاری بھی آجاتی لیکن عمل مسلسل جاری رہا۔ گرتے ہوئے گراف کو تھامنے کی کبھی انہوں نے سنجیدہ کوشش بھی نہیں کی اور اب جب کہ گراف بالکل ہی گر گیا تھا تو ہر طرف سے اس پر تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔

یہ تو بالکل ممکن نہیں تھا کہ سارے کے سارے لوگ ایک جگہ بیٹھ کر صورت حال کا تجزیہ کریں اور کسی نتیجے پر پہنچ کر کوئی مثبت راستہ اختیار کریں۔ اس قسم کی کوشش بھی فضول تھی۔ بس یہی غنیمت تھا کہ جابہ جا دو چار آدمی آپس میں مل بیٹھتے۔ کم سے کم یہ لوگ دل کھول کر اپنے خیالات کا اظہار تو کر لیتے، اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے اور شاید کسی نتیجے پر بھی پہنچ جاتے۔

''بھئی، ہم نے تو اپنے طور پر ساری کوششیں کر ڈالیں، کوئی راستہ نکلتا دکھائی نہیں دیتا......''

وہ بڑے مغموم لہجے میں گویا ہوا۔

''مشکل یہ ہے کہ ہماری ساری کوششوں کو دوسری نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، ایسی صورت میں ہمارے اندر اعتماد پیدا نہیں ہوتا......''

دوسرے کا لہجہ بھی کم مغموم نہیں تھا۔

''ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے درمیان اچانک اتنی مضبوط اور لمبی دیوار کیسے آکھڑی ہوئی ــــ؟ یہ چیز ایک دن یا ایک لمحے کی دین تو ہوتی نہیں ہے......''

تیسرے کا انداز بیحد معصوم تھا۔ سب کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ ان نگاہوں میں اس کے لئے ترحم تھا، پر کوئی بولا کچھ نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد نمبر ایک گویا ہوا۔

"کیوں بھائی — ؟ تم نے اپنی نگاہیں کہیں اور رکھ چھوڑی تھیں کیا — ؟ بھلے ہماری نگاہیں نہ دیکھ رہی ہوں لیکن محسوس تو ہم بہت دنوں سے کر رہے تھے کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا......"

"جیسے......جیسے......کیا ہوگا......؟"

تیسرے کے لہجے میں تجسس تھا۔ یا تو واقعی وہ معصوم تھا یا پھر وہ انہیں کے منہ سے کچھ سننا چاہتا تھا۔

"تمہیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہے کیا — ؟"

اس نے پھر سادگی سے پوچھا۔

"بھئی یہ تو ہم مان ہی نہیں سکتے کہ تمہاری سوچ ہم سے الگ ہوگی — ؟ نا ایسا ممکن ہی نہیں، پھر کیوں تم ایسے معصومانہ سوال کر رہے ہو......؟"

نمبر ایک نے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

تیسرا شرمندہ ہو گیا۔ اس کے منہ سے کچھ نکل ہی نہیں سکا۔ اس کی خاموشی پر نمبر ایک بھی سرد پڑ گیا اور نرم لہجے میں بولا۔

"پتہ نہیں، تم کس موڈ میں یہ سب کچھ پوچھ رہے تھے ورنہ یہ تو بچہ بچہ جانتا ہے کہ معاملہ کیا ہے۔ بھلے ہی جس وقت گھیرا ہم سے دور تھا، اس وقت ہم میں سے بہتوں کو دکھائی نہ دیا ہو، لیکن اب تو سورج کی روشنی میں سب کچھ سامنے آ گیا......"

تیسرا توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ باقی لوگوں پر کوئی خاص اثر نہیں تھا۔ چوتھے نے قدرے اکتاہٹ کے انداز میں دریافت کیا۔

"کیا اس پر ہمیں اپنی پوری طاقت صرف کرنی چاہئے کہ جو دیوار ہمارے درمیان اٹھ گئی

ہے یا اٹھادی گئی ہے وہ کیسے دور ہو......؟

''پہلے ایک بات طے ہو جائے —— '' دوسرے نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی کہ ہم یہاں جو کچھ طے کریں گے، اسے سب کو ماننا ہوگا، میرا مطلب ہے جو یہاں موجود نہیں، وہ بھی......''

''بہت مشکل ہے......''

سب کی زبان سے بیک وقت نکلا۔

''تو پھر ہماری دماغ سوزی کا فائدہ؟''

اس نے صاف لفظوں میں اظہار خیال کیا۔ایک لمحہ کے لئے ایسا لگا جیسے سب کے چہرے پر مایوسی کا پیلا پن چھا گیا۔دوسرے ہی لمحہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی، اس نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

''ارے بھائی! اس سوچ کو ہم پکڑے رہیں گے تو پھر کچھ نہیں کرسکیں گے۔ ہمارا ایک جگہ جمع ہونا، حالات کا تجزیہ کرنا اور کسی متفقہ نتیجے پر پہنچنا کتنا ناممکن ہے، یہ ہم میں سے کون نہیں جانتا، لیکن ہم انفرادی کوشش بھی چھوڑ دیں تو پھر اندھیرے سے بھرے ہوئے غار میں گرنے اور گرتے رہنے کے سوا اور کون سا راستہ بچ جاتا ہے......''

''آپ مختصر ترین لہجے میں صرف یہ بتادیں کہ ہماری انفرادی کوششوں کا فائدہ کیا ہو گا —— ؟''

دوسرے نے اس کی بات گویا درمیان ہی میں کاٹ دی۔

''بھائی! ہم کسی اہم نتیجے پر پہنچ جائیں تبھی دوسروں تک اسے پہنچا سکتے ہیں نا۔ ہم خود کو اندر سے مضبوط کرلیں، پھر دوسروں کو اپنی بات منوانے پر مجبور کرسکتے ہیں۔ یہ ہرگز مت بھولئے کہ میری طرح آپ کی طرح، بے شمار افراد چھوٹے چھوٹے گروپ میں کہیں نہ کہیں بیٹھ کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کررہے ہوں گے......''

یہ سن کر سب کے چہرے پر ایک شگفتگی سی دوڑ گئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ ان کے اندر کے تناؤ نے باہر آ کر دم توڑ دیا۔ ان کی نگاہوں میں امید کی موہوم کرنیں پھوٹنے لگیں۔ ساری کی ساری کرنیں اسی کی طرف مرکوز تھیں۔ نمبر دو پر امید لہجے میں بولا۔

''آپ نے ان مسائل پر اچھی طرح سوچ لیا ہے تو پھر بتائیے کہ آگے کیا ہو۔ آپ ہی کے کہنے پر ہم نے اپنے اندر کی تمام چیزوں کا غائر مطالعہ کر لیا اور شک و شبہات کے جالے صاف کرنے کی کوشش کی، لیکن دوسروں کے جالے کیسے صاف ہوں......؟''

وہ یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا۔

''آپ کو یاد ہے، بہت پہلے کسی نے راہ چلتے چلچلاتی دھوپ میں میری آنکھوں پر آئینہ چمکایا تھا — ؟''

''خوب یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ ہم لوگوں نے اس پر کافی ہنگامہ بھی کیا تھا۔ ان کے پاس شکایت لے کر گئے تھے۔ منتہا تک یہ بات پہنچی تھی......''

نمبر دو کا جواب جوش سے بھرا تھا۔ سب کے سر تائید میں ہل گئے۔

''نتیجہ کیا نکلا تھا اس ہنگامے کا، یہ بھی یاد ہے آپ کو......؟''

اس نے ترچھی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''نتیجہ کیا نکلتا — ؟ انہوں نے کہا مجرم پکڑ لاؤ، پھر ہم سزا بھی دیں گے......''

نمبر تین نے سب کی طرف سے جواب دیا۔

''تو ہم مجرم کو نہیں پکڑ سکے نا......؟''

اس نے اسی انداز میں دریافت کیا۔ اس کے اس انداز پر وہ لوگ کچھ بد دل سے ہو گئے۔ نمبر تین نے پھر کہا۔

''ہم مجرم کہاں سے پکڑ کر لاتے — ؟ وہ تو ان کے درمیان تھا، اسے تو انہیں ہی پکڑنا تھا، انہوں نے کمال ہوشیاری سے گیند ہمارے آنگن میں پھینک دی......''

پھر سب خاموش ہو گئے۔ یہ عجیب بات تھی کہ جب بھی وہ کچھ بات کرنے کی کوشش کرتے خاموشی، کسی نہ کسی زاویے سے ان کے بیچ ضرور آ ٹپکتی۔ اگر چہ وہ اسے دور بھگانے کی کوشش بھی کرتے تھے، مگر اس عمل میں ان کی کافی طاقت صرف ہو جاتی۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ خاموشی پھر ان کے درمیان کود ی، انہوں نے حسب معمول اسے دور کرنے کی کوشش کی۔ اس عمل میں وہ رفتار، جس کے بل پر وہ اپنی گفتگو کو آگے بڑھا رہے تھے، بھٹک سی گئی اور انہیں محسوس ہوا کہ انہیں نئے سرے سے اس رفتار کا دامن تھامنا ہوگا۔

نمبر ایک نے کہا۔

''ایک مشکل ہمارے ساتھ یہ ہے کہ ہم ہر بات میں انہیں سے اپنا موازنہ کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح ہر سطح پر، ان سے ہمارا مقابلہ ہو جاتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس موازنے میں زیادہ تر ہم ان سے ہار جاتے ہیں، یہ بات بالکل الگ ہے کہ ہم اپنی ہار کو تسلیم نہیں کرتے اور طرح طرح کی تاویلوں سے اپنے آپ کو تشفی دیتے رہتے ہیں......''

نمبر دو نے بات آگے بڑھائی۔

''ارے بھائی، ہم ایسا نہ کریں تو پھر زندہ کیسے رہیں۔ مسلسل شکست کے احساس سے ہم مر نہیں جائیں گے......میرا مطلب ہے اخلاقی موت......اس لئے بھائی، زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم شکست کو اپنا مقدر نہ سمجھیں......''

نمبر تین بولا۔

''ہمیں یہ مان کر چلنا چاہئے کہ ہم تعداد میں کم ہیں اس لئے جب بھی مادی یا روحانی تقسیم ہوگی، ہمارے حصے میں کم آئے گی یا کمتر آئے گی......''

یہ بات شاید لوگوں کو پسند نہیں آئی۔ ان کے چہروں پر تیوریاں سی چڑھنے کی ایک جھلک ابھری جس نے ان کے اندر کا حال بیان کر دیا۔

نمبر چار نے کہا۔

''لیکن ہم کم کہاں ہیں یار...... کہیں کہیں تو ہم اتنے زیادہ ہیں کہ بس ہم ہی ہم ہیں لیکن وہاں بھی تو ہمیں ذلت ہی کا سامنا ہے، پھر ہم لنگڑی تاویلیں کیوں اپنائیں......؟

نمبر ایک نے جواب دیا۔

''ارے بھائی، پوری دنیا کی سیاست اور جغرافیہ کو مت کنگھالو، جہاں رہ رہے ہو، وہاں کے بارے میں سوچو، یہ سوچو کہ ہم ناکردہ گناہوں کی سزا سے کیسے بچیں......؟''

سب قدرے شرمندہ سے ہوگئے۔ بات صحیح تھی۔ وہ تو ایک مسئلے کے حل کے لئے اکٹھے ہوئے تھے بلکہ بار بار اکٹھے ہو رہے تھے اور تقریباً ہر بار وہ اپنی حدوں کو پھلانگ جاتے۔ اس سے نہ تو مشکل کا حل نکلتا تھا نہ وہ اپنے آپ کو مطمئن کر پاتے تھے۔ یوں ان کے درمیان ہر بار کوئی ایسا ضرور ہوتا جو انہیں کھینچ کر مرکز کی طرف لانے کی کوشش کرتا، وہ آ بھی جاتے، لیکن کچھ دیر کے بعد پھر بہک جاتے۔

نمبر دو بولا۔

''مان لو، ہم ایک ناکردہ گناہ کی سزا سے کسی طرح بچ نکلتے ہیں، مگر اس کی کیا گارنٹی ہے کہ آئندہ ہم پھر کسی ناکردہ گناہ میں معتوب قرار نہیں دئے جائیں گے۔ وہ تو کسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہہ دیں گے کہ اصل مجرم یہی ہے۔ پھر اپنی بے گناہی ثابت کرتے کرتے اس کی پوری عمر بیت جائے گی۔ اس ایک کی ذہنی کوفت میں ہم سب حصہ دار ہو جائیں گے اور پوری قوم ایک نامعلوم عرصے تک ناکردہ گناہ کے احساس سے دبی رہے گی۔ یہ احساس اسے سچ مچ کے گناہ کرنے پر بھی اکساتا رہے گا......''

''ابھی ہم لوگ بہت آگے کی نہ سوچیں تو بہتر ہے۔ ابھی تو جو ہماری آنکھوں کے بالکل سامنے ہے، اس کے بارے میں سوچیں۔ ہمیں زیادہ پیچھے جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ ہم میدان جنگ میں ہیں۔ ہم پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں

اور ہمیں ابھی صرف اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچنا ہے اور بس......''
نمبر ایک نے انہیں سمجھایا۔
''بھیا، آپ نے میدان جنگ کا نام لیا مگر میدان جنگ میں تو اپنے بچاؤ کے لئے جنگ بھی کرنی پڑتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے......''
نمبر دو مسکرا کر بولا۔ اتنے سنجیدہ اور گرم ماحول میں اس کی یہ پہلی مسکراہٹ تھی۔ نمبر ایک نے فوراً جواب دیا۔
''محبتَ میں بھی ـــــ لیکن یہاں نہ محبت کا موقع ہے نہ جنگ کا، معاملہ صرف اپنی بقا کا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ لوگ معاملے کی نزاکت کو شاید سمجھ نہیں رہے ہیں۔ ہم اس فوری آفت سے فوراً نہیں نکلے تو ہم آفتوں کے ایک لامتناہی سلسلے میں الجھتے چلے جائیں گے۔ ابھی ابھی جو مالا ہمارے گلوں میں ڈالی گئی ہے وہ بہت دنوں سے گتھی جا رہی تھی، اس کے ایک ایک دانے بہت سوچ سمجھ کر ٹانکے گئے ہیں اور اس کام میں ہم نے بھی جانے انجانے ان کی بہت مدد کی ہے......''
نمبر ایک کے جملے بہت طویل ہوتے تھے جس سے کبھی کبھی انہیں بہت الجھن ہوتی تھی۔ الجھن کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی باتوں سے باتیں نکلتی جاتی تھیں اور پھر یاد نہیں رہتا تھا کہ انہوں نے کہاں سے شروع کیا اور کہاں تک پہنچے۔ وہ جہاں پہنچتے تھے، اس کے بارے میں انہوں نے پہلے کبھی سوچ نہیں رکھا ہوتا تھا۔ نمبر تین نے اپنا سر کھجاتے ہوئے اسے روکا اور اکتاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔
''ارے بھائی، باتیں تو ہم بہت سن چکے، سیدھے سیدھے یہ بتاؤ کہ ہمیں کرنا کیا چاہئے......؟''
نمبر ایک نے بھی جواباً دھیرے سے اپنا سر کھجایا اور قدرے بشاش لہجے میں بولا۔
''بھائی، ہمارے پاس حل ہی ہوتا تو پھر ہم بار بار سر جوڑ کر کیوں بیٹھتے ـــــ؟ میں تو اقلیدس کی طرح بھرے بازار میں ایک دم سے دوڑ جاتا ......''

سب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ویسے اس مسکراہٹ میں اندر کی سرخی شامل نہیں تھی۔ نمبر دو دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''تو گویا ہم ابھی تک اندھیرے ہی میں ہاتھ پیر مار رہے ہیں......''

''سوچ کا ایک سچ یہی ہے پیارے۔ لیکن اطمینان رکھو، اس تاریکی سے روشنی کی کرن ضرور پھوٹے گی، شرط صرف یہ ہے کہ ہم اندھیرے ہی میں سہی، ہاتھ پاؤں مارنا نہیں چھوڑیں......''

نمبر ایک کا لہجہ بہت شانت تھا۔

تہذیب منہ پر بہت سے تالے لگا دیتی ہے، وقت اور مصلحت کے مطابق جس تالے کو کھولنا ہوتا ہے، اسے کھولتی ہے، پھر منہ بند کر دیتی ہے لیکن شاید ایسا کچھ نہیں ہوا تھا کہ بیک وقت سبھی تالوں کو اس نے کھول دیا تھا اور ایک طرف کو ہو کر سارے تماشے دیکھ رہی تھی، اسے اپنا بھرم بھی تو رکھنا تھا۔

مجسمہ پر حملہ کی وجہ سے لوگوں نے برسہا برس سے جمے جمائے اپنے اندر کے میل کچیل کو کھرچ کھرچ کر باہر نکالنا شروع کر دیا تھا۔ اپنے میل کچیل کو پھینکنے کے لئے انہوں نے صرف ایک ہی نشانہ باندھا تھا......صرف ایک ہی نشانہ......

اور یہ نشانہ کوئی کچرا نہیں، ایک جاندار تھا۔ اس پر ہر چہار طرف سے کچرے ڈالے جا رہے تھے۔ اپنے آپ کو بچانے کی تدبیر میں اس کے جسم کے سارے اعضا متحرک ہو گئے تھے مگر مشکل یہ تھی کہ ایک طرف زوردار حملے سے بچاؤ کی کوشش ہوتی تو حملے کا زور دوسری طرف بڑھ جاتا، ادھر بچاؤ کی تدبیر اختیار کرتے کرتے کافی نقصان ہو جاتا۔

عجیب بات یہ تھی کہ حملہ اور بچاؤ دونوں کا زور بڑھتا جاتا تھا۔ اس کے باوجود حملے کا زور کم ہوتا نہ بچاؤ میں کوئی کمی آتی۔ بچاؤ میں کمی نہ آنے کی وجہ تو سمجھ میں آتی تھی کہ

جب تک جان ہوتی ہے، اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پیر مارا ہی جاتا ہے اور اس میں اپنی بچی کھچی پوری طاقت جھونک دی جاتی ہے، اتنی دیر میں حملہ کرنے والے تھک جاتے ہیں۔ دونوں کی نفسیات الگ الگ ہوتی ہے۔ حملہ آور شروع میں جتنا زبردست اور طاقتور ہوتا ہے، اخیر میں نہیں رہتا جب کہ بچاؤ پارٹی کو اپنے خون کی آخری بوند بھی بہادینی پڑتی ہے۔ یہ صورت حال حملہ آور کے لئے بھی تشویشناک تھی۔ ظاہر ہے کہ حملہ ہمیشہ زبردست نقصان پہنچانے بلکہ ختم کردینے کے لئے ہی ہوتا ہے۔

وہ زیادہ نہیں تھے، لیکن جو بھی تھے وہ لاکھوں پر بھاری۔ ان کی آواز لاکھوں میں سنی جاتی تھی۔ یوں بھی اس قسم کی فیصلہ کن باتیں جلسہ عام میں تو ہوتی نہیں۔ چھوٹی چھوٹی محفلوں میں جو فیصلے ہوتے ہیں، وہی عام لوگوں پر لاگو کئے جاتے ہیں۔

پروفیسر جو پڑھاتے کم، سوچتے زیادہ تھے اور اس سے بھی زیادہ اپنی سوچ کو بھلاتے تھے، گمبھیرتا سے بولے۔

''دیکھو بھائی، مجرم کوئی ایک نہیں، کئی ہیں اور کئی کے پیچھے بھی بے شمار لوگ ہیں۔ یہ برسہا برس سے ان کی تعلیمات اور ان کی سرگرمیاں اس کا پتہ دے رہی تھیں کہ کبھی نہ کبھی کوئی بڑا واقعہ انجام پذیر ہوگا، سو انہوں نے اسے انجام دے دیا۔ اب ہمارے سادہ لوح کہتے ہیں کہ جو مجرم ہے، اسے پکڑو، سب کو پریشان کیوں کرتے ہو، ارے بھائی، تعلیم تو سبھی پاتے ہیں نا! ذہنی طور پر تو سب اس میں شریک ہیں اور صرف ذہنی طور پر کیوں، اس کام میں کن لوگوں نے مدد بہم پہنچائی ہے، اس کا پتہ چلنا آسان ہے کیا ـــ ؟

پروفیسر کی مختصر تقریر سے سناٹا سا چھا گیا، یوں یہ اس سناٹے سے قطعی مختلف تھا جو دوسری نشستوں میں اکثر چھاتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ڈپٹی صاحب نے کچھ بولنے کے لئے اپنا گلا صاف کیا۔ وہ سرکاری نوکری میں بحیثیت سب ڈپٹی کلکٹر داخل ہوئے تھے، اسی وقت سے ان کا نام ڈپٹی صاحب

پڑ گیا تھا بلکہ ان کا اصل نام صرف ان کے گھر والوں اور چند قریبی لوگوں کو ہی یاد رہ گیا تھا۔ یوں انہوں نے سب ڈپٹی کلکٹر سے ڈپٹی کلکٹر، پھر میدان خالی ہونے اور حالات موافق ہونے کے سبب آئی اے ایس تک چھلانگ لگا دی تھی اور اعلیٰ سرکاری عہدوں کو سرفراز کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے تھے۔ سبکدوشی کے بعد انہوں نے بطور شکریہ اپنی ساری زندگی مذہب، اس کے پھیلاؤ نیز اس کی حکمرانی کی کوششوں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس محفل کے وہ بہت اہم رکن تھے اور بہت سنجیدگی اور تجربے کے سارے بوجھل پن کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے، اپنے مخصوص لہجے میں بولے۔

''سوال ان کے چھپنے کا نہیں ہے، سوال ہمارے پکڑنے کا ہے۔ ہم تو اچھی طرح جانتے ہیں نا کہ مجرم کون ہیں۔ ہمیں اپنا دباؤ بڑھاتے رہنا چاہئے۔ اور یہ تو ایک جانا مانا سدھانت ہے کہ آپ سو مانگیں گے تو پچاس تو آپ کو ملے گا ہی۔ ہم لوگوں نے اتنی لمبی زندگی گزاری، کبھی کسی چیز کو سو فیصد مان کر نہیں چلے......''

ڈپٹی صاحب شاید ابھی آگے بھی بولتے کہ انجینئر صاحب نے دخل دیا۔

انجینئر صاحب کی تاریخ بھی کافی شاندار تھی۔ انہوں نے اپنا کیریر اورسیئر کے طور پر شروع کیا تھا اور قسمت کی یاوری سے چیف انجینئر کے عہدے تک جا پہنچے۔ اس میں وہ اپنی ہوشیاری، جوڑ توڑ، ارباب اختیار سے قربت اور حاکموں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے زیادہ اوپر والے کی مہربانی کو ذمہ دار سمجھتے تھے۔ لہذا جب وہ اپنی مصروف ترین زندگی سے فارغ ہوئے تو خدائی فوجدار بن گئے تھے بولے۔

''بھائی، انکار تو وہ کسی صورت کر ہی نہیں سکتے۔ بت اور مجسمے صرف وہی لوگ توڑ سکتے ہیں اور کوئی نہیں۔ انہیں اس کی تعلیم بھی دی جاتی ہے، ان کی تاریخ بھی گواہی دیتی ہے۔ جہاں جہاں انہیں موقع ملا ہے، انہوں نے بت توڑے بھی ہیں۔ بت توڑنے والوں کو ان کی تاریخ میں جگہ ملتی ہے۔ وہ انکار کرتے ہیں تو پھر وہی بتائیں کہ آخر اس خوبصورت

مجسمے کو کس نے توڑا ؟ ہم تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے......''

اس پر وکیل صاحب نے کہا......وکیل صاحب......

کیریر تو انہوں نے شروع کیا تھا ایک نامی وکیل کے منشی کے طور پر، لیکن آگے بڑھنے کی لگن تھی اور نامی وکیل کی ہمت افزائی کہ وہ کام کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی کرتے رہے، پہلے مختار بنے، بہت دنوں تک مختار صاحب کہلاتے رہے، پھر باقاعدہ وکالت کا امتحان پاس کیا۔ منشی گیری اور مختاری سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع مل گیا تھا، تجربات قدم قدم پر رہنمائی کرتے رہے، نامی وکیل کا کوئی وارث ان کے پیشے کو اپنانے پر تیار نہیں ہوا، ڈاکٹر، انجینئر بن کر سب مغربی ہرے بھرے گھاس کی خوشنمائی میں کھو گئے۔ نتیجہ یہ کہ انہیں جما جمایا کھیت مل گیا۔ نامی وکیل کے معنوی وارث وہی قرار پائے، انہیں وکیل صاحب کا ایسا لقب نصیب ہوا کہ لوگ اصل نامی وکیل کو بالکل بھول گئے اور صرف وہی رہ گئے...... وکیل صاحب......

''ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا۔ یہ معاملہ قانونی داؤ پیچ میں نہ الجھنے پائے۔ ایسے لوگوں کی آخری پناہ گاہ قانون ہی ہوتا ہے اور قانون ہمیشہ کاغذات دیکھتا ہے، حقیقت نہیں۔ اس لئے اسے اندھا بھی کہا جاتا ہے اور بہرہ بھی۔ پھر ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ کیس دادا نے کیا تو فیصلہ کی کاپی پوتے کے ہاتھوں میں تھمائی جاتی ہے، ہوسکتا ہے اس سے بھی آگے کی سیڑھی آجائے، اس لئے زیادہ باتوں میں پھنسنے کی ضرورت نہیں، یہ معاملہ اچانک سامنے نہیں آیا، برسہا برس سے چل رہا ہے اور اس لئے چل رہا ہے کہ کسی نے سنجیدگی سے انہیں گھیرنے کی کوشش نہیں کی۔

اب ایک نادر موقع ہاتھ آگیا ہے۔ اسے چھوٹا یا غیر اہم مت سمجھئے اور یہ سوچئے کہ سینکڑوں برس سے چلی آرہی دہشت گردی کو کس طرح ہمیشہ کیلئے ختم کردیا جائے......''

لیکھک بہت کم بولتے تھے، سوچتے زیادہ تھے، جب بہت زیادہ سوچ لیتے تو مختصر الفاظ

میں اس کا خلاصہ کر دیتے۔ انہوں نے زندگی میں بہت پاپڑ بیلے تھے۔ پرائمری اسکول کی نوکری سے زندگی کی ابتدا کی اور لکھنے لکھانے کے شوق کو جی جان سے اپنایا۔ پہلے پہل اخباروں میں ایڈیٹر کے نام خط لکھے، مقامی ہندی اخباروں میں تواتر سے چھپنے کے باعث اخبار پڑھنے والوں کے حلقے میں خاصے مشہور ہو گئے تھے اور ان کا نام لیکھک پڑ گیا تھا، اس میں 'صاحب' یا 'جی' کا لاحقہ موقع اور مرضی کی مناسبت سے لگا لیا جاتا۔ نوکری چھوڑ کر وہ ایک اخبار کے رپورٹر بن گئے، تب ان کا نام کم اور رپورٹ زیادہ چھپنے لگی، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے مختلف اخباروں اور رسالوں میں چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنے شروع کر دئے۔ ایک آدھ مضمون طویل بھی ہو جاتا۔ کچھ کہانیاں بھی چھپ گئیں۔ نظمیں لکھنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ جسے دوسری زبان والے ترجمہ کر کے نثری نظم کے عنوان سے چھاپ لیتے۔ ان کا اصول تھا کہ وہ لکھنے ہی پر زیادہ انحصار کرتے، بولنے پر کم، بولتے بھی تو بہت اصرار کے بعد اور ہمیشہ اخیر میں۔ ان کی بات دھیان سے سنی جاتی تھی۔ ان سے لوگوں نے کچھ بولنے کی گزارش کی تو انہوں نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ حاضرین پر ڈالی، ابھی کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو نہیں بول پائے تھے۔ وہ گمبھیرتا سے بولے۔

''آپ سب لوگ بول لیجئے، پھر میں کچھ کہوں گا......''

اس پر نہیں بولنے والوں نے کہا کہ وہ اپنا وقت انہیں ہی دیتے ہیں، وہ جو کچھ بولیں گے، وہی ان کی بات مانی جائے۔

لیکھک اس پر راضی نہیں ہوئے اور اپنے روایتی گمبھیر لہجے میں بولے۔

''نہیں بھائی، میں اس بات کو پسند نہیں کرتا، کچھ لوگ خاموش رہیں اور کچھ اپنی رائے کا اظہار کریں...... نا...... اسی طریقہ کار نے ہمیں آج اس دن کو پہنچا دیا کہ دشمن ہمارے آنگن میں گھس آیا۔ کوئی مسئلہ بھی ہو، سب کو اس پر سوچنا چاہئے اور سب کو اپنی رائے

دینی چاہئے......"

ان کا انداز اور لہجہ کچھ ایسا تھا کہ سب لوگوں نے اتفاق کے طور پر اپنا سر جھکا دیا، پھر جب سب کی نگاہیں اٹھیں تو ان لوگوں پر جم گئیں جو ابھی تک خاموش بیٹھے تھے۔

ان میں سے ایک بہت بڑا تاجر تھا۔ صرف اس شہر میں نہیں، دوسرے شہروں میں بھی اس کے کاروبار پھیلے ہوئے تھے، وہ سوچ بچار کر کسی انجمن سے باقاعدہ وابستہ تو نہیں ہوا تھا لیکن اسے ایسی نشستوں میں بلایا ضرور جاتا اور وہ کچھ نہیں بولتا تھا، پھر بھی اپنی باتوں کی تائید کے لئے لوگ اس کی طرف ضرور دیکھتے، وہ کبھی مسکرا دیتا، کبھی سر ہلا دیتا، کبھی تالیاں بجا دیتا اور کبھی اپنی زبان سے ٹھیک ہے، بہتر ہے، بالکل صحیح، وغیرہ ادا کرتا رہتا، اس کے اتنا ہی کہنے کو تو لوگ بہت جانتے۔

اس وقت بھی وہ اپنے اسی انداز میں تھا یعنی 'ہوں،' 'ہاں' اور سر ہلانے تک۔ مگر لیکھک کی مختصر تقریر کے بعد سب کی نگاہیں اس پر بار بار پڑنے لگیں تو وہ گھبرا گیا اور پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اس کے ماتھے پر چمک اٹھیں۔

"میں جانتا ہوں کہ جو آپ کہہ رہے ہیں، وہ بالکل سچ ہے، سچ کے سوا کچھ نہیں اور جو آپ فیصلہ کریں گے، اسے میں بے چون و چرا مان لوں گا......"

اس کی بات سے اور لوگ تو متفق دکھائی دیے لیکن لیکھک ایک دم قائل نہیں ہوا۔ اس نے خلاف معمول کسی کے بولنے سے پہلے ہی بولنا شروع کر دیا۔

"یہی تو کمزوری ہے ہماری کہ ہم چپ چاپ اپنے آپ کو بھیڑ سمجھ لیتے ہیں، جدھر ہمیں ہانک دیا جائے بس ادھر ہی چل پڑتے ہیں۔ اسی بے خبری میں تو ہم مار لئے جاتے ہیں۔ آخر آپ اپنے آپ کو ایسا کیوں سمجھتے ہیں، آپ روز ہزاروں آدمیوں سے ملتے ہیں، بھانت بھانت کے لوگوں سے آپ کا واسطہ پڑتا رہتا ہے، آدمی کی پرکھ جتنی آپ کو ہونی چاہئے، دوسروں کو کہاں ہو سکتی ہے، ہمیں ہر قیمت پر آپ کے وچار چاہئیں......"

اس پر تاجر نما شخص نے جیب سے رومال نکال کر ماتھے اور چہرے پر ابھری پسینے کی بوندیں خشک کیں جواب بڑے بڑے قطروں کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے بہت گرمی لگ رہی ہے۔ حالانکہ وہ کچھ وقت لینا چاہتا تھا تا کہ اپنے آپ کو کچھ کمپوز کر سکے۔ بھرے بازار میں دو دو نی چار کرنا ایک الگ بات ہے اور غور وفکر کی ایک مخصوص نشست میں اظہار خیال کرنا ایک بالکل علیحدہ چیز۔

اس نے دھیرے دھیرے بولنے کا آغاز کیا۔

''ہم جس دنیا کے آدمی ہیں وہاں اپنے دل کی باتوں اور اندرونی بھاؤناؤں کو سندر شبدوں کی تھالی میں پرونے کا ہنر نہیں سکھایا جاتا، ہم تو سدا آپ کے پیچھے چلتے اور آپ کی بات مانتے آئے ہیں، اس لئے آپ جو کہہ رہے ہیں بس وہی صحیح ہے یعنی ہمارے مجسمے پر حملہ ہوا ہے، اسے معمولی نہ سمجھا جائے۔ یہ کوئی پتھر کی مورت پر نہیں، بلکہ حملہ سیدھے ہم پر ہوا ہے اور ہم نے اس کا منہ توڑ جواب نہیں دیا تو آئندہ سچ مچ ہم پر حملہ ہو سکتا ہے، اس لئے......''

وہ آگے نہیں بول سکا۔ سب لوگ دلچسپی اور حیرت سے اس کو تک رہے تھے۔ ابھی ابھی اس نے کہا تھا کہ اسے شبدوں کی تھالی پر وسنا نہیں آتا، لیکن دوسرے ہی لمحہ میں اس نے اپنی ہی بات مسترد کر دی۔

لیکھک کے چہرے پر اطمینان کی ایک ہلکی پرت جھلکی۔ وہ اس کی ادھوری بات سے مطمئن نظر آئے، پھر انہوں نے دوسرے شخص کی طرف دیکھا۔ وہ شخص پہلے والے کی طرح با قاعدہ تاجر تو نہیں تھا، مگر کبھی کبھی یہ کام بھی کر لیا کرتا تھا۔ دراصل اس کے ماں باپ اس کے لئے بہت پیسے چھوڑ کر مرے تھے۔ دولت اتنی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھوں میں سماتی ہی نہیں تھی، وہ خرچہ کرنے کے نت نئے طریقے ڈھونڈتا رہتا۔ اس جستجو میں کبھی کبھی اسے بہت زیادہ گھاٹا ہو جاتا، کبھی بے سان وگمان فائدہ بھی ہاتھ لگ جاتا۔ دونوں

صورتوں میں اس کی صحت پر کوئی زیادہ اثر نہیں ہوتا تھا کیوں کہ ہر دو طریقوں سے اس کا وقت تو آسانی سے کٹ ہی جاتا۔ فی الوقت اس نے ایک ہفتہ وار جاری کر رکھا تھا جس کے مقاصد وہی تھے جو کم و بیش یہاں کے لوگوں کے تھے۔ ان کی پسند اور رجحان کی خبریں اور مضامین اس کے ہفتہ وار میں آسانی سے چھپ جاتے۔ اس قسم کی نشستوں میں اسے باقاعدہ بلایا جاتا تھا۔ یوں وہ زیادہ تر خاموش ہی رہتا یعنی سنجیدہ مسائل میں۔ ویسے خوش گپیاں کرنے میں وہ بہت آگے آگے رہتا۔ وہ پہلے بھی تنہا نہیں چلتا تھا۔ جب سے وہ ہفتہ وار کا مالک بنا تھا، تب سے اس نے ایک اسسٹنٹ بھی رکھ لیا تھا جو نہ صرف ساتھ چلتا تھا بلکہ ان محفلوں کی باتیں لگاتار لکھتا رہتا۔ اس قسم کے پرزے جمع کر کے ایک بڑے ذمہ دار کو دے دئے جاتے، وہ ان میں سے اپنے کام کی باتیں چن لیتا اور شائع کرنے کو بھیج دیتا۔

وہ لیکھک اور دوسرے لوگوں کی اٹھتی ہوئی نگاہوں سے ذرا نہ گھبرایا اور مسکرا کر بولا۔

''میں تو اخبار کا آدمی ہوں اور آپکے پاس آنا بھی اسی لئے ہوں کہ آپکی باتوں اور وچار کا پرچار کر سکوں، آپ میرا جو وچار جاننا چاہتے ہیں، وہ تو اخبار میں چھپ ہی جائے گا......''

اس کی باتوں سے دوسرے لوگ تو مطمئن نظر آئے لیکن لیکھک کی نگاہیں بجھ سی گئیں اور وہ اپنے روایتی خشک لہجے میں بولا۔

''وہاں آپ کی ایک الگ حیثیت ہے، یہاں آپ کی حیثیت دوسری ہے۔ ہم لوگ دوسروں کے وچاروں کو سن سن کر ان پر اپنی مہریں لگاتے جائیں تو یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔ آپ اتنے دنوں سے ہمارے سمپرک میں ہیں تو کوئی وجہ تو ہوگی جو آپ کو ہم سے جوڑے ہوئی ہے، بس آپ وہی وجہ بتا دیجئے......''

وہ آدمی بھی ہوشیار تھا، اچھی اچھی محفلیں دیکھے ہوئے تھا اس لئے بالکل نہیں گھبرایا، بس اپنی سوچ کے گھوڑے کو زبردست ایڑ لگائی۔ شاید اس کا تیز رفتار گھوڑا اپنی منزل مقصود پر

پہنچ بھی گیا اور تب وہ قدرے گمبھیر لہجے میں بولا۔

''یہ ایک ایسا گھناؤنا جرم ہے کہ معافی وافی کی بات ہمیں بالکل بھلا دینی چاہئے، بلکہ اسے ایک سنہری موقع سمجھنا چاہئے جو بھگوان نے ہمیں بخشا ہے۔ یہ آخری موقع ہے انہیں کٹہرے میں کھڑا کرنے کا، اسے ہرگز ضائع نہیں ہونا چاہئے۔ بہت سر چڑھ گیا ہے ان کا۔ آخر وہ کھل کر کیوں نہیں کہتے کہ انہوں نے بت شکنی نہیں کی، انہوں نے مجسمے پر حملہ نہیں کیا اور وہ اس قسم کی حرکتوں کو گناہ سمجھتے ہیں......''

''یہ ہوئی نا بات......'' لیکھک فرط جوش سے چہک اٹھا، اس کا یہ روپ بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا۔ وہ جو کوئی اہم بات کہنے سے قبل کا وقفہ اس کا ہوا کرتا تھا، اس وقت مفقود تھا۔ لوگ اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے آگے کہا۔

''میں چاہتا ہوں ہم میں سے ہر شخص سوچنے والا بن جائے، ہر معاملے میں اس کی اپنی ایک سوچ ہو، کوئی ضروری نہیں کہ ہر ایک کی سوچ برابر اور ایک جیسی ہو، بلکہ بالکل الگ الگ سوچ ہو۔ آپ غور کیجئے اس طرح سوچوں کے کتنے خزانے ہمارے ہاتھ آجائیں گے۔ میں چاہتا ہوں آپ مجھ سے اختلاف کیجئے، زور شور سے اختلاف کیجئے بلکہ ہو سکے تو میری بات یا کسی کی بات کو ہرگز مت مانئے لیکن بھگوان کے لئے اپنی بات کو منوانے کا حوصلہ پیدا کیجئے اور جب کوئی بات بند کمرے میں طے ہو جائے تو اس پر ہر قیمت پر قائم رہئے، چاہے دنیا کچھ بھی کہے۔ مجھے آپ کے وچار جان کر بہت خوشی ہوگی۔ اطمینان ہوا کہ ہمارے درمیان ایسے لوگ ہیں جو اپنی سوچ، اپنا وچار رکھتے ہیں ......''

لیکھک نے ایک طائرانہ نگاہ سب پر ڈالی، کونے میں بھی ایک آدمی اور بچ رہا تھا جو کچھ کہنے سے رہ گیا تھا۔ وہ کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں، شہر بلکہ ریاست کا ایک معروف و مصروف ڈاکٹر تھا، اس کے ایک ایک لمحے کی قیمت تھی۔ ایک ایک مہینہ کے اس کے اوقات فروخت ہوتے تھے، وہ تو اس کی اپنی دلچسپی تھی کہ وہ یہاں چلا آتا تھا، ورنہ اس جیسے

مصروف ترین شخص کا وقت نکال کر یوں کہیں چلا جانا حیرت کا باعث ہوا کرتا تھا۔ جب کبھی وہ یہاں چلا آتا تو لوگ اپنے آپ کو خاصا احسان مند محسوس کرتے تھے۔ وہ اس کی موجودگی سے صرف توانائی نہیں بلکہ اپنے اندر ایک برقی تحریک سی محسوس کرتے، لیکھک نے اسے مخاطب کیا۔

''ڈاکٹر صاحب...... ہمیں آپ کے وچار بھی چاہئیں۔ آپ ان معاملوں پر کیا سوچتے ہیں اور......''

''بھائی، جو آپکے وچار، وہی ہمارے وچار، ایسا نہ ہوتا تو پھر میں یہاں آتا ہی کیوں......''

ڈاکٹر نے لیکھک کی بات درمیان ہی میں کاٹ دی۔

اسکے اسمارٹ جواب پر لوگوں کے چہرے پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ مگر لیکھک سنجیدہ بنا رہا۔

''ڈاکٹر صاحب ہم آپ سے ہرگز یہ امید نہیں رکھتے کہ آپ دوسروں کے پیچھے چلیں گے یا دوسروں کے وچار کو اپنائیں گے......نا......آپ تو ان لوگوں میں ہیں جن کے پیچھے ایک زمانہ چلتا ہے، آپ کے وچاروں کو اپنانے میں دوسرے گرو محسوس کرتے ہیں۔ آپ کی نہ صرف اس معاملے میں، بلکہ تمام معاملوں میں ضرور ایک سوچ ہوگی جو ہم ہر حال میں جاننا چاہیں گے......''

لیکھک کے کہنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ڈاکٹر صاحب سنجیدہ ہو گئے اور اپنا گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔

''میرے کہنے کا مطلب تھا کہ جب ہم ایک ہی چنتا لے کر یہاں آئے ہیں تو ہماری چنتن بھی ایک ہونی چاہئے۔ مجھے آپ کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ ہم یہاں کھل کر بات کریں، وچاروں کا کھلے من سے آدان پردان ہو، ایک دوسرے سے سہمتی نہ بھی ہو مگر جب سہمتی بن جائے تو پھر ہم سیسہ پلائی ہوئی ایک دیوار بن جائیں جسے کوئی چھونے کی بھی ہمت نہ کرے......دوسری بات یہ ہے کہ آپ اس پر زور نہ دیں کہ ہر شخص کچھ بولے

ضرور۔ یہ صحیح ہے کہ اس سے آپ کے پاس مختلف خیالات کا ایک مجموعہ ضرور ہو جائے گا، اس سے ایک نقصان بھی ہونے کا اندیشہ ہے کہ پھر ان میں سے کسی ایک بات کو چن لینا آپ کے لئے ناممکن ہو جائے گا۔ ویسے جب کچھ ہم خیال آپس میں ایک رشتہ میں بندھتے ہیں تب بھی تو ایک جگہ مل بیٹھتے ہیں۔ آپ نے دیکھا، یہاں سب نے اپنے اپنے طور پر خیالات ظاہر کئے، آپ ان کا تجزیہ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ بنیادی بات سب کی ایک ہی ہے۔ پھر آپ کو اسے قبول کرنے میں کون سی قباحت ہے۔ دو آدمیوں یا ان سے زیادہ کے خیالات ایک جیسے نہیں ہو سکتے ہیں —؟''

ڈاکٹر صاحب کی بات ختم ہوئی تو محفل پر ایک عجیب سناٹا سا چھا گیا۔ یہ ان سناٹوں سے قطعی مختلف تھا جو اس سے پہلے اس محفل میں یا دوسری محفلوں میں چھا تا رہتا تھا۔ لیکھک کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا یا اگر تھا تو دیکھنے والوں کی فہم سے باہر تھا، ویسے سب کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ اب صرف اسے ہی بولنا تھا، دوسروں کو بس سننا تھا، بولنا تو انہیں بہت پہلے تھا مگر انہوں نے خود ہی اپنے وقت کو دوسروں میں تقسیم کر دیا، یوں تقسیم ہونے کے بعد بھی اب سارا وقت انہیں کا تھا۔ اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سب پر ڈالی اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی بات شروع کی۔

''مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ وہ لوگ جو یہاں خاموش بیٹھے رہتے تھے، ان کے وچار بھی ہمیں سننے کو ملے اور افسوس بھی ہوا کہ ہم پہلے ان سے محروم کیوں رہے...... یہ بھی اندازہ ہوا کہ چپ رہنے پر کچھ لوگوں کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، وہ صحیح نہیں ہوتی۔ ہمیں فخر ہے کہ اب ہمارے درمیان اونچی سوچ اور اونچے آدرش اور وچار رکھنے والے پیدا ہو رہے ہیں۔ میری تو زیادہ تر باتیں آپ ہی نے کہہ دیں۔ اب میں آپ کا وقت مزید ضائع نہیں کروں گا۔ ہم بار بار اس پر زور دے رہے ہیں کہ ہمیں مجرموں کو ہر حال میں پکڑنا ہے، پر یہ کوئی نہیں بتاتا کہ کیسے؟ جو مجرم ہیں وہ اپنے جرم کا

کبھی اعتراف نہیں کریں گے اور ہم ان کے بارے میں نہیں جانتے ہوئے بھی قانونی گرفت میں نہیں لے سکتے، دوسری بات یہ کہ یہ کوئی ایک شخص یا کسی ایک مجرم کی بات تو ہے نہیں، بھلے اس گھناؤنے کام کو کسی ایک آدمی یا چند لوگوں نے انجام دیا ہو لیکن اپنے دل سے، اپنے وچاروں سے، اپنے مزاج سے اور اپنے ردعمل سے لاکھوں کروڑوں افراد اس جرم میں شامل ہیں، انہیں آپ کیسے پکڑیں گے، کیسے سزا دیں گے......؟"

سب بیخود ہو کر لیکھک کی باتیں سنتے رہے۔ اسکی ایک ایک بات انکے دل کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی تھی، لمبی تقریر اور لمبی بات انہیں پسند نہیں آتی تھی، لیکن لیکھک کا دم لینے کے لئے رکنا انہیں بالکل اچھا نہیں لگا۔ لیکھک نے چہروں پر یہ تاثر پڑھ لیا۔ میز پر رکھے پانی کا گلاس اٹھا کر اس نے اپنا حلق تر کیا اور بہت اعتماد کے ساتھ آگے بڑھا۔

"آپ کچھ مجرموں کو سزا دے بھی ڈالیں تو اس سے کیا ہو جائے گا—؟ ان کی جگہ فوراً دوسرے لے لیں گے اور وہی کام یا اس سے بھی بڑے کام انجام دینے لگیں گے۔ اصل چیز ذہنی تربیت ہوتی ہے اور یہ چیز بہت دنوں سے چل رہی ہے......یعنی ہم مجرموں کو پکڑ لیں تب بھی فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔"

"اس کا مطلب یہ کہ ہم مجرم کو پکڑیں ہی نہیں اور ہاتھ ہاتھ پر دھرے چپ چاپ بیٹھے رہیں......"

ایک نے قدرے تلخ لہجے میں لیکھک کی بات کاٹی۔ لیکھک مسکرا دیا۔

"میں نے یہ کہاں کہا بھائی—؟ میں نے تو ابھی اپنی بات پوری بھی نہیں کی، اصل بات کی طرف تو میں اب آ رہا ہوں......"

ٹوکنے والا شرمندہ سا ہو گیا اور دوسروں کی طرح ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گیا۔ لیکھک نے آگے اپنی بات جاری رکھی۔

"واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ہم ایک ایسی جنگ میں گھر گئے ہیں جس میں ہم پر حملے تو ہو رہے

ہیں لیکن دشمن ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں، یوں ہم جانتے ہیں کہ دشمن کون ہے، پھر بھی ہم اس کو حملہ کرنے سے روک نہیں سکتے۔ میری ایک بات یاد رکھئے کہ جنگ میں فوری طور پر وہی ٹکنیک اپنائی جاتی ہے جس سے دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچ سکے اور یہ ٹکنیک وہی ہوتی ہے جو خود دشمن کی، ہمارے سلسلے میں ہوتی ہے......"
سب لوگ نہایت اشتیاق کے عالم میں لیکھک کو دیکھتے رہے کہ شاید وہ کچھ آگے بھی کہے لیکن اتنا کہہ کر اس نے اپنے ہونٹ یوں سی لئے جیسے وہ اب ہرگز کچھ نہیں بولے گا۔

عبادت گاہوں، مذہبی علامات، جذبوں کے نشانات اور گاہے گاہے روزی روٹی اگلنے والی بھٹیوں پر حملے ہونے لگے اور حملہ آور ہاتھ نہیں آئے تو اچانک لوگوں کو احساس ہوا کہ یہ واقعات اچانک نہیں ہو رہے، ان کے پیچھے منظم دماغ کام کر رہے ہیں۔ فطری طور پر ان کے اندر فکرمندی کی لہروں نے جنم لینا شروع کیا۔
حملے باقاعدہ نہیں تھے بلکہ چھیڑ خانی کے زمرے میں آتے تھے۔ کبھی کسی عمارت کی کوئی دیوار توڑ دی، کبھی عبادت گاہ کے اندر پرانے، گندے جوتے پھینک دئے، کبھی بھٹیوں پر پانی کے مٹکے ڈال دئے گئے، کبھی مذہبی علامتوں سے قیمتی چادریں نوچ لی گئیں، کبھی جذبوں کے نشانات پر نجس گوشت کے ٹکڑے پھینک دئے گئے، وغیرہ وغیرہ۔
ان باتوں سے کوئی بڑا جانی یا مالی نقصان تو نہیں ہوتا تھا لیکن کوفت ایسی ہوتی کہ ہفتوں ان کے منہ سوجے رہتے، خیالات منتشر ہو جاتے۔ اس عالم میں وہ ڈھنگ کی کوئی بات سوچ ہی نہیں سکتے تھے، کیوں کہ مثبت خیالات کی کھڑکیاں اچانک بند ہو جاتیں اور وہ بند کھڑکیاں دھڑ ادھڑ کھل جاتیں جن سے سرخ وسیاہ، تیز وتند ہوائیں اندر گھسنے لگتیں۔ جو اندر سے مضبوط ہوتا اس پر تو یہ ہوائیں اثر نہیں کرتیں، جو کمزور ہوتا، اس کی اندرونی دیواروں پر یہ سرخ آڑی ترچھی لکیریں چھوڑ جاتیں۔ اس افراتفری میں لوگ مزیدار

کھانوں کی مہک بھی بھول جاتے اور ہمیشہ اسی تگ ودو میں لگے رہتے کہ......

طرح طرح کی باتیں سامنے آرہی تھیں۔ جن لوگوں کی اندرونی دیواروں پر آڑی ترچھی لکیریں نمایاں ہوتیں، ان کی آنکھیں اتنی سرخ ہو جاتیں کہ لگتا خون ابل دیں گی، وہ دوسروں کی آنکھوں میں بھی اپنے سرخ چہرے دیکھنے کے متمنی ہوتے تھے۔ یوں ایسے لوگ تعداد میں بہت قلیل تھے لیکن ایک چھوٹا سا سرخ دھبہ میلوں پھیلی ہوئی سفید گھاس پر دور سے نظر آجاتا تھا۔ دوسری طرف ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو سفید گھاس کی طرح یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ان کے دامن پر دور دور سے کہیں کوئی سرخ دھبہ دکھائی دے۔ یہ وہ لوگ تھے جو دل سے چاہتے تھے کہ ان حرکتوں کا ملزم گرفت میں آجائے اور اسے قرار واقعی سزا ملے۔ اس کے لئے وہ تگ ودو بھی کرتے تھے۔ قانون کے رکھوالوں سے ان کا رابطہ بھی ہوتا تھا اور ان کے وعدوں پر وہ یقین بھی کرتے تھے۔ ان وعدوں کو وہ یقین کی صورت لوگوں تک پہنچاتے بھی تھے۔ مگر ہوتا یہ تھا کہ ابھی وعدے یقین کی صورت اختیار بھی نہیں کرتے تھے کہ دوسرا واقعہ رونما ہو جاتا تھا اور معاملہ پھر پرامید نگاہیں، وعدے، وعدوں کو یقین کی صورت قائم کرنے کی کوششیں......ایک سائیکل تھا جس کے چاروں طرف تمام چیزیں چکر کاٹتی تھیں۔ جو چیز جہاں سے شروع ہوتی، گھوم پھر کر وہیں پہنچ جاتی۔ اس چکر سے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔

وہ کم لوگ تھے جو سفید گھاس پر سرخ دھبے کی صورت نظر آتے تھے۔ ان کی زمین اتنی سخت تھی کہ کسی وعدے کا کوئی پھول وہاں نہیں کھلتا تھا۔ کسی بھی کوشش کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ دوسری طرف کے لوگ باہمت تھے کہ کوشش کئے جاتے تھے، مشکل یہ تھی کہ جب بھی کوئی نیا واقعہ ہوتا سفید گھاس پر ایک اور دھبہ پڑ جاتا اور کئی دھبے مل کر ایک نسبتاً بڑے دھبے کی شکل اختیار کر لیتے۔ اس پر ستم یہ کہ اس دھبے کو کئی گنا بڑا

دکھانے کی کوشش بھی کی جاتی۔ کچھ لوگ ان کوششوں سے متاثر بھی ہوتے۔ اگرچہ یہ تاثر وقتی ہوتا کیوں کہ جو لوگ تعداد میں ان سے کہیں زیادہ تھے، انہیں مزید متاثر ہونے اور متاثر ہوتے رہنے سے روک دیتے، پھر بھی سرخ دھبے کی خبر دوسروں تک پہنچ ہی جاتی اور دوسرے ان سے بھی زیادہ بڑھا چڑھا کر اس کی چرچا کرتے۔ وہ سامنے والوں کی آنکھوں پر ایسی پٹی چڑھا دیتے کہ انہیں سامنے کا سارا منظر ایک ہی رنگ میں رنگا نظر آتا، وہ سننے والوں کے کانوں پر ایسا آلہ چڑھا دیتے کہ انہیں بس ایک ہی آواز سنائی دیتی۔ آواز پر مکمل یقین ...... آنکھ اور کان پر قبضہ کر لینے کے بعد سوچنے والوں کے لئے بہت کم محنت باقی رہ جاتی تھی۔ ان کا مقصد اتنے ہی میں حل ہو جاتا۔ اتنی کوششوں کے بعد وہ سامنے کے منظر پر اپنی مرضی کے مطابق رنگ چڑھا دیتے تھے۔

یہ ایک عجیب صورت حال تھی جس پر وسیع پیمانے پر غور و خوض کیا جانا چاہئے تھا اور صحیح صورت حال کی برآمدگی کی کوشش کرنی چاہئے تھی لیکن اس سے ایک خطرہ بھی تھا۔ جن لوگوں نے آنکھوں، کانوں اور سوچ پر اپنے قبضے جما لئے تھے وہ اس کوشش کو پتہ نہیں کیا رنگ دے دیتے۔ رنگوں پر بھی انہوں نے اس خوبصورتی اور ہوشیاری سے اپنے قبضے جما لئے تھے کہ وہ جس چیز کو چاہتے، اس چیز کو اپنے پسندیدہ رنگ میں رنگ دیتے۔ دوسروں کے پاس تو کوئی رنگ بچا ہی نہیں تھا، سوائے ایک سفید رنگ کے، سو وہ اس کے بچانے ہی کی کوشش میں اپنی ساری طاقت صرف کر دیتے۔ اگر وہ غور و خوض کی کوئی بڑی محفل سجا لیتے تو اسے بھی خاص رنگ میں دکھانے کی کامیاب کوشش کی جاتی جس کی وجہ سے فائدہ تو انہیں کچھ نہ ہوتا، نقصان بہت زیادہ ہو جاتا۔

پہلے کی طرح چھوٹی چھوٹی محفلیں بھی رنگوں کے دسترس سے باہر نہ تھیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ دیواروں کے پیچھے کس کے کان لگے ہوئے ہیں یا جس عزیز یا دوست کو انہوں نے از راہ محبت بٹھا رکھا ہے، اس کے اندرونی تار کہاں سے جڑے ہوئے ہیں۔

چنانچہ گھریلو تقریبات اور چلتے پھرتے، سرگوشیوں میں ان بڑی بڑی باتوں پر اظہار خیال کیا جانے لگا۔

سرگوشی نمبر ایک — ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم تاریکی میں کھڑے ہیں، ہمارے چاروں طرف تیز روشنیوں کا ہالہ ہے جس کی خفیہ آنکھوں سے ہماری ایک ایک حرکت پر نظر رکھی جارہی ہے۔لطف یہ ہے کہ دیکھنے والوں کو ہم نہیں دیکھ سکتے۔

سرگوشی نمبر دو — لگتا ہے ہم تلچھٹ ہو کر، ایک طرف کو سمٹ کر اوپر آ گئے ہیں۔ ہر شے نے ہمیں اپنے اندر سے کھرچ کر باہر کر دیا ہے اور اب ہم کسی میں بھی نہیں، بالکل علیحدہ ہیں......

سرگوشی نمبر تین — اتنی دیر سے آپ لوگ کیا کانا پھوسی کر رہے ہیں بھائی......؟

سرگوشی نمبر ایک اور دو، بہ یک زبان گھبرا کر — نہیں بھائی ہم کانا پھوسی کیا کریں گے، ہم تو ایک دوسرے کی خیریت دریافت کر رہے تھے......

سرگوشی نمبر تین — (مسکرا کر) ''خیریت دریافت کرنا کیا معنی — ؟ خیریت تو چہروں پر لکھی ہوتی ہے، آپ لوگوں کو چہروں پر لکھی تحریر پڑھنا نہیں آتا کیا — ؟''

سرگوشی نمبر چار — آپ لوگ جو باتیں بھی کر رہے ہوں، ایک جگہ جمع ہو کر ہرگز نہ کریں چلتے پھرتے......ہوسکتا ہے کہ کچھ تیز نگاہیں آپ پر لگی ہوئی ہوں......

ان کے پیروں میں فوراً حرکت ہوئی اور وہ متحرک ہو گئے۔

سرگوشی نمبر ایک — بھائی، اب کیا صورت ہے اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کی — ؟ اب تو ایسا لگتا ہے کہ ہمارے سارے ذرائع بند ہو چکے ہیں اور ہم ایک اندھے کنویں میں ڈھکیل دئے گئے ہیں......

سرگوشی نمبر دو — شاید ابھی مکمل نہیں ڈھکیلے گئے ویسے ڈھکیلے جانے کا عمل پوری شدومد کے ساتھ شروع تو ہو ہی چکا ہے اور ہم یقیناً اندھے کنویں کے قریب جا پہنچے ہیں......

سرگوشی نمبر تین — یہ بتائیے کہ کیا واقعی ہم چپ چاپ اندھے کنویں میں جا ہی گریں

— ؟اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے ہمارے پاس — ؟

سرگوشی نمبر ایک — ڈھونڈنا ہوگا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حالات کی طرح ہم بار بار ایک جگہ نظر نہ آئیں۔ ہم بالکل نہیں جانتے کہ ہمیں کون، کن نگاہوں سے، کس کونے سے دیکھ رہا ہے اور ہماری معمولی چلت پھرت کو کیا معنی پہنائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں انہیں رائے دے بھی دوں تو اس سے کیا ہوگا — ؟ کیا صرف میری رائے سے ہم سب اندھے کنویں میں جانے سے بچ جائیں گے — ؟

سرگوشی نمبر تین — کم سے کم آپ تو بچ جائیں گے، ہوسکتا ہے میں بھی بچ جاؤں......

سرگوشی نمبر ایک — آپ کو یہ غلط فہمی کیسے ہوگئی کہ میرے پاس علاالدین کا کوئی ایسا چراغ ہے جس کے جلتے ہی ہم آپ بچ جائیں گے — ؟ نا...... ایسا ہی ہوتا تو میں اسے روشن کرنے میں دیر کیوں کرتا۔ ایسا کر کے سب کو بچا نہیں لیتا......

سرگوشی نمبر دو — (ٹیڑھی میڑھی کرسیوں کو سیدھی کرتے ہوئے) — کم سے کم، ہم اپنے اپنے طور پر کچھ سوچیں تو......

سرگوشی نمبر تین — (ایک کرسی کو اٹھا کر تقریباً وہیں پر رکھتے ہوئے) — ایک دو بات ہو تو بتائی بھی جائے اور سوچی بھی جائے......

سرگوشی نمبر ایک — (ایک کرسی پر بیٹھ کر دوسری خالی کرسی دونوں پیر رکھتے ہوئے)
— پھر بھی...... پھر بھی......

سرگوشی نمبر تین — (اچانک اٹھتے ہوئے) — ارے اٹھو بھائی، ہم یہاں مہمان بن کر نہیں آئے، ہم گویا میزبان ہیں، مہمانوں کا خیر مقدم کرنا، ان کی خاطر مدارات ہمارا فرض...... اور تمہاری بات کا جواب یہ ہے کہ ہم نے اپنی تاریخ بھلادی، اپنے وجود کی اہمیت کو بھلا دیا، یہاں آنے کا مقصد بھول بیٹھے، زندگی گزارنے کا سلیقہ بھلا دیا...... کس کس چیز کو روؤ گے اور کہاں تک سدھارو گے......

سرگوشی نمبر ایک ـــ تو پھر ہم یہی طے کرلیں کہ ہمیں ہر حال میں اندھیں کنویں میں چلے جانا ہے پھر کیوں نہ ہم ہنستے ہنستے غار میں گریں، بزدلوں کی طرح منہ بسورتے ہوئے کیوں جائیں......

اس بات پر سب نے حونقوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دیر تک دیکھتے رہے۔

یہ بھی ایک چھوٹی سی محفل تھی......

بڑی محفلیں تو محض جبر و استبداد کی نمائش کے لئے منعقد ہوتی تھیں، اس کے لئے جو لوازمات ہوتے تھے، وہ سب کے پاس موجود بھی نہیں ہوتے تھے، پھر چھوٹی محفلیں جو بڑے کام کر جاتی تھیں، وہ بڑی محفلیں کرنے سے معذور تھیں۔

جیسا کہ معلوم ہے چھوٹی محفلیں بلائی نہیں جاتیں، خود بخود برپا ہو جاتی ہیں، اس کے لئے کوئی ایجنڈا، کوئی ضابطہ، کوئی باقاعدگی، کوئی کورم، کوئی مقام، کوئی وقت پہلے سے طے نہیں ہوتے تھے۔ جب بھی دو چار ہم خیال مل جاتے اظہار خیال کر لیتے۔

اس محفل میں جو لوگ مل بیٹھے تھے، ان کی نگاہیں پیچھے سے زیادہ آگے کو دیکھنے کا شوق رکھتی تھیں اور اس شوق میں وہ کسی قسم کی دیواروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔

اصل میں وہ سوچنے سمجھنے والے لوگ تھے، کوئی ان کی سنے نہ سنے، وہ اپنی بات دوسروں تک ضرور پہنچا دیتے۔ وہ پڑھے لکھے لوگ بھی تھے، اس لئے جس بات کو صحیح سمجھتے، اسے لکھ بھی ڈالتے اور اس کی کوشش بھی کرتے کہ ان کی باتوں، ان کے خیالات کی تشہیر بھی ہو۔ انہیں اپنے لئے کچھ نہیں چاہئے تھا، وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اتنا ضرور حاصل کر لیتے جو ان کی کج کلاہی کو برقرار رکھنے میں معاون ہو جاتا۔ البتہ وہ دوسروں کے لئے بہت کچھ سوچتے اور دوسروں کی حاصل شدہ چیزوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے، ایسے تھے وہ لوگ۔

پروفیسر صاحب ہمیشہ وہ بات سوچتے جو آگے کی تاریک راہوں کو روشن کرتی جاتی۔ اگر چہ وہ ایک دقیانوسی سماج سے آتے تھے، پھر بھی اپنے وچاروں کے سبب نمایاں دکھائی دیتے۔ نمایاں اس لئے نہیں کہ لوگ انہیں پسند کرتے تھے بلکہ اس لئے کہ اپنے وچاروں سے وہ زیادہ لوگوں کو خوش نہیں کر پاتے تھے، یعنی ناپسندیدگی کے افق پر وہ نمایاں نظر آتے۔ مگر وہ کسی ناپسندیدگی کے سبب اپنے خیالات اور اس کی تشہیر کو ترک نہیں کرتے تھے بلکہ مخالفت کے شور میں ان کی آواز اور شدت اختیار کر لیتی تھی۔ انہیں بھیڑ چال کی پروا نہیں ہوتی تھی بلکہ جس بات کو وہ صحیح سمجھتے، اس کی تشہیر کی انہیں زیادہ فکر ہوتی تھی۔

اپنے مخصوص گمبھیر لہجے میں انہوں نے سب کو مخاطب کیا۔

''ایک بات بتاؤ بھائیو! اگر ایک بھیڑ ہمارا کھیت چر جائے تو ساری بھیڑوں کو مار دینا چاہئے کیا۔۔۔''

چھوٹا سا سوال تھا لیکن اس کا فوری جواب نہیں ملا، تھوڑی دیر کے بعد کوی جی نے اس کا جواب یوں دیا۔

''ایک بھیڑ کو بھی کیوں مارا جائے ۔۔۔ ؟ سزا فنا کر دینے کا تو نام نہیں، سزا کی دوسری صورتیں بھی ہو سکتی ہیں، تنبیہ کیلئے دوسری کارگر صورتیں بھی اختیار کی جا سکتی ہیں......''

کوی جی ۔۔۔ کوی جی ایک مست مولا قسم کے آدمی تھے۔ انہوں نے اپنے دل میں ایک صاف و شفاف آئینہ چڑھا رکھا تھا، اس لئے وہ اپنے آئینے میں سب کو صاف و شفاف دیکھتے تھے، کچھ لوگ انہیں پاگل اور خبطی بھی سمجھتے، پر اس کی انہیں بالکل پروا نہیں تھی۔ وہ جہاں کچھ لوگوں کو یکجا دیکھتے، اپنی بات رکھنے کی کوشش ضرور کرتے، نثر میں نہیں تو شاعری کے وسیلے سے۔ وہ اپنے آپ کو محبت کا پیغامبر کہتے تھے۔ اس نوعیت کی جب بھی کوئی محفل آراستہ ہوتی، چاہے اس کے پیچھے کوئی عیار ذہن ہی کام کر رہا ہو، کوی جی وہاں بن بلائے پہنچ جاتے اور اپنا راگ الاپنے لگتے۔ کچھ لوگ انہیں تفریح کا ذریعہ سمجھتے، مگر انہیں

کسی بات کی پروانہیں تھی، وہ اپنا پیغام محبت اپنی پوری طاقت سے لوگوں تک پہنچادینا اپنا فرض اولین سمجھتے۔ان سے بارہا پوچھا گیا کہ آخرایسا کرنے میں انہیں کیا ملتا ہے، سادہ سا جواب ملتا، لوگوں کے کان میں آواز تو پڑ جاتی ہے۔کبھی کان اور دل کے راستوں میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتو شاید دل میں بھی اتر جائے۔

''آپ تو تھیوری کی زبان بول رہے ہیں، تھوڑا پریکٹیکل بنئے تو بات شاید کچھ آگے بڑھے......''

یہ جگنو تھے، نام تو پتہ نہیں ان کا کیا تھا لیکن چونکہ فری لانس جرنلسٹ تھے، جگنو کے نام سے اخباروں میں سیاسی اور سماجی تبصرے فرماتے اور خوب خوب پڑھے جاتے۔ چاکری کو کبھی منہ نہیں لگایا، ویسے کئی اخباروں نے ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنے کی کوشش کی تھی، پر ان کا کہنا تھا ابھی وہ زنجیر ہی ایجاد نہیں ہوئی جس میں ان کو باندھا جا سکے۔

''کہنے کا مطلب ہے، آپ برائی کی جڑ کی طرف دھیان کیوں نہیں دیتے۔ دیکھئے کہ برائی کا شروت کیا ہے، ہم وہیں اس کا علاج کر دیں تو پھر برائی جڑ ہی نہیں پکڑنے پائے......''

کوی جی نے اپنی بات واضح کرنے کی کوشش کی۔ اگر چہ ان کی بات اب بھی وضاحت طلب تھی لیکن محفل دانشوروں کی تھی اس لئے اتنا ابہام چل سکتا تھا۔

''بات تو آپ کی صحیح ہے بھائی......'' اونکار جی نے اپنا جملہ شروع کرتے ہوئے گلا صاف کیا، وہ جانے مانے آرٹسٹ تھے اور بہت آزاد خیال، ان کے کاموں کی نمائش ملک کے بڑے شہروں کی آرٹس گلیری میں ہو چکی تھی۔انہیں کئی بار نمائش کے سلسلے میں باہر جانے کا موقع بھی ملا تھا۔ وہ اپنی کچھ پینٹنگس کے سبب تنازعہ میں بھی پڑ چکے تھے۔ پر انہوں نے ہار نہیں مانی تھی اور اپنے کاموں کی غلط ڈھنگ سے تشریح کرنے والوں کو چیلنج کرتے رہتے تھے۔

''......سوال یہ ہے کہ یہ کام ایک دو آدمی کے کہنے کرنے سے ممکن ہے کیا؟ اس کیلئے بہت

بڑی تحریک چلانی ہوگی جس کا بہت ورودھ بھی ہوگا، کہنے کا مطلب ہے یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا دکھائی دیتا ہے، ویسے ہم تو چائے کی میز پر اس قسم کی باتیں تو روز ہی کرتے ہیں......"

"حل سامنے کا ہے اور سب کی سمجھ میں بھی آتا ہے لیکن واقعی حل کرنا کتنا مشکل ہے بھائیو......"

رام سیوک ہزاری...... پرانے سوشلسٹ، اپنے اصولوں اور حالات کے سبب زندگی میں بہت دکھ اٹھا چکے تھے۔ کئی بار چناؤ لڑے مگر تکڑم بازی نہ جاننے کی وجہ سے بہت کم کم ووٹوں سے ہار گئے۔ ایک بار ان کی ہم خیال حکومت بھی بن گئی تھی تو اس نے انہیں کھادی گرام ادھیوگ کا چیرمین بنا دیا تھا۔ ویسے اس عہدے پر کم ہی دن رہے لیکن اتنے ہی دنوں میں اتنی نیک نامی کمائی کہ وہ ان کی عملی پہچان بن گئی۔ جس محفل میں بیٹھ جاتے ان کی باتیں توجہ سے سنی جاتی تھیں۔

"آپ بھی اس پر کچھ روشنی ڈالیں......"

کسی نے ان سے گزارش کی۔

"روشنی کیا ڈالنا ہے، تاریخ آپ کے سامنے کھلی ہے۔ ہم تاریخ اور اپنے عمل میں آسمان و زمین کا فرق پاتے ہیں اور یہی فرق ہمیں اپنے راستے سے بھٹکا دیتا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ ہماری بڑی بدنصیبی ہے کہ ہم ہمیشہ دوسرے کے ہاتھ کا کھلونا بنے رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ہماری تاریخ تک صحیح نہیں لکھی گئی اور غلط تاریخ ہمیں ہمیشہ غلط راستوں پر لے جاتی رہی ہے۔ تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس غلط راستے پر ہم اتنی دور نکل آئے ہیں، وہاں سے واپس، صحیح راستے پر پھر گامزن ہونا کچھ آسان ہے کیا ـــ؟"

ہزاری جی کی باتوں سے ایک خاموشی سی چھا گئی۔ اس کا مطلب تھا ان کی باتوں کا لوگوں پر اثر ہوا تھا۔ لیکن جیسا کہ دستور ہے دانشوروں پر فوری طور پر کسی بات کا اثر تو ہوتا ہے مگر یہ اثر دیر تک برقرار نہیں رہتا۔

سنیل جی خاموشی سے سب کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ یوں بھی کم بولتے تھے، سنتے تھے

زیادہ، بہت سوچ سمجھ کر اپنی زبان کھولتے۔انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز اوائل جوانی میں بائیں بازو کے پلیٹ فارم سے کیا تھا۔ بہت سرگرم انقلابی رہے۔ان لوگوں میں شامل تھے جو ہر آتی جاتی ٹرین سے انقلاب کی آمد کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ ایک انتہا پسند دائیں بازو میں شامل ہو گئے، جب تک اس کی سرگرمیوں میں شامل رہے، صف اول میں رہے اور بھگوا کپڑے زیب تن کرتے رہے اور اسکی آئیڈیالوجی کا زور شور سے پرچار کرتے رہے۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ ایک انقلابی بھی یوں بدل سکتا ہے۔لیکن انہوں نے اپنا چولا پھر بدل لیا، کانگریس پارٹی میں چلے گئے، پھر اسے بھی چھوڑ دیا۔اب صرف دانشوری کا کاروبار کرتے تھے، وہ بھی بالکل مفت۔
چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔اس درمیان کوئی کچھ نہیں بولا۔سنیل جی نے اپنا گلا کھنکھار کر صاف کیا اور یوں گویا ہوئے۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ہم یہاں کیوں اکٹھا ہوئے ہیں، کیا گفتگو کر رہے ہیں اور کیوں......''

پھر خاموشی چھا گئی۔لیکن اس دفعہ کی خاموشی بھی دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ایسا ہوتا تو اس کا سلسلہ بہت طویل ہو جاتا۔ان کی اس بات پر کسی کو تعجب نہیں ہوا۔پانڈے جی نے بہت متانت سے جواب دیا۔

''بات یہ ہے بھائی صاحب کہ ہم بہت ذمہ دار شہری ہیں۔اپنے ملک کے مفاد اور بہتری کے بارے میں سوچتے ہیں۔ہم اسلئے سر جوڑ کر بیٹھے ہیں کہ اپنے ملک میں ہر قیمت پر امن وامان برقرار رہے، اس کے لئے ہمیں جو قربانی بھی دینا پڑے ہم پیچھے نہیں ہٹیں......''

پانڈے جی تھے تو بزنس مین لیکن سوچ دانشورانہ رکھتے تھے۔ہمیشہ مثبت انداز میں گفتگو کرتے اس وجہ سے وہ سماج کے سبھی طبقوں میں بہت مقبول تھے۔فلاحی کاموں میں پیش پیش رہتے اور اس سلسلے میں کسی تفریق کو راہ نہیں دیتے۔ویسے وہ بہت دھارمک

آدمی تھے، ہر سال تیرتھ یاترا پر ضرور جاتے اور جب تک چاروں دھام پر اپنا ماتھا نہیں ٹیک لیتے، انہیں چین نہیں آتا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے مذہب کو اپنی ذات تک محدود کر رکھا تھا۔ وہ اس بات کا اعلانیہ تھے کہ مذہب اگر ایسا ہو تو پھر مذہب سے بڑھ کر نجات کا کوئی راستہ نہیں۔

''میں سمجھتا ہوں — ''سنیل جی بولے — ''پر میرا ماننا ہے کہ ہم اپنے طور پر کیوں باتیں کریں اور کیوں کسی نتیجے پر پہنچیں۔ اس سوچ میں اور لوگوں کو بھی تو شامل ہونا چاہئے۔ خاص طور پر ان کو جن کے بارے میں ہم خاص طور پر باتیں کر رہے ہیں......''

''آپ صحیح فرماتے ہیں — ''پانڈے جی نے ان کو مطمئن کرنے کا مورچہ سنبھالا۔ ''مگر جب تک ہم آپس میں کھل کر باتیں نہ کرلیں اور کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہ پہنچ جائیں انہیں شامل کر کے کیا ہوگا — ؟''

اس وقت صورت حال صف بندی جیسی ہوگئی ہے، لیکن ہر دو طرف کا بڑا طبقہ اسے ہرگز پسند نہیں کرتا۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے اس درمیان وہ بھی ضرور ہی باتیں کر رہے ہوں گے اور کسی ایک نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہوں گے......''

''ایسا ہے تو بہت خوشی کی بات ہے۔ ویسے میں بہت پرامید نہیں ہوں کہ انہوں نے بھی وہی لائن اختیار کی ہوگی جو ہم نے اختیار کی ہے......'' سنیل جی کا جواب تھا۔

''کوئی چارہ نہیں ہے نا، ان کے پاس بھی۔ ان کے چند لوگوں کی غلط حرکتوں کے سبب خود ان کی زندگی اجیرن ہو رہی ہے اور وہ کیوں چاہیں گے کہ وہ اپنی تباہی کے راستے کو مضبوطی سے پکڑے رہیں......''

جگنو بول اٹھے۔

سنیل جی مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی۔ لیکن سب لوگ اپنی اپنی سوچ میں یوں مستغرق تھے کہ کسی نے اس مسکراہٹ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے

خود ہی وضاحت کر دی۔

''ارے بھائی، آپ جن لوگوں کے بارے میں اتنی گمبھیرتا سے وچار کر رہے ہیں، زندگی کے بارے میں ان کی کیا سوچ ہے، اس کی جانکاری ہے آپ کو......؟''

''مطلب......؟''

یہ بے ساختہ سوال سب کے دلوں میں اچھلا، ویسے برآمد ہوا کسی ایک ہی کی زبان سے۔

''مطلب — ؟'' پانڈے جی پھر مسکرائے۔

''مطلب یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور اسے کامیاب بنانے کی مہم میں لگے رہتے ہیں۔ اس زندگی کی وہ زیادہ پروا نہیں کرتے......''

سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

''ہماری زندگیوں کو تو ایسا ہونا ہی چاہئے۔ ہمیں دنیا سے کیا لینا دینا۔ ہمارے، لئے تو سارے وعدے آخرت کے ہیں......''

نوجوان نے اپنی اس چھوٹی سی سیاہ داڑھی کو ہلکے سے سہلایا۔

ایک لمحہ کے لئے جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ اس خاموشی کو فوراً توڑا نہیں جاتا تو ہمیشہ کے لئے مسلط ہو جاتی شاید۔ ایک ادھیڑ عمر شخص نے جنھوں نے انتظامیہ کے ایک اعلیٰ عہدے سے بس ابھی ریٹائرمنٹ لیا تھا، سوال کیا۔

''آپ کا کہنا صحیح ہے میاں! لیکن یہاں کی زندگی اس لئے اہم ہے کہ اسی زندگی کی کامیابی پر آخرت کی زندگی کا دارومدار ہے، یہ پتہ ہے نا آپ کو — ؟''

''خوب پتہ ہے، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آنے والی زندگی کو ہم بالکل بھول جائیں اور دنیاوی زندگی کے حصول میں تن من دھن سے لگ جائیں......''

نوجوان کا لہجہ خاصا تیز تھا۔ کئی چہروں پر اس کا اثر مرتب ہوا لیکن اس وقت سوائے

برداشت کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس لئے ایک دوسرے معمر شخص نے اس اثر کو کم کرنے کی کوشش کی۔

''بھائی ہمیں آنے والی زندگی پر مکمل ایقان ہے اور اس پر بھی کہ اس زندگی میں جو کچھ ملے گا، اس کا تعلق موجودہ زندگی ہی سے ہوگا، لیکن اس ایمان اور ایقان کے بعد بھی یہاں کی زندگی کی اہمیت ہرگز کم نہیں ہوتی۔ سوچنے کی بات ہے کہ خالق دو جہاں نے آخر یہ خوبصورت دنیا کیوں بنائی، اس میں بیل بوٹے کیوں اگائے، چرند و پرند اور انسان کو کیوں پیدا کیا، زمین کی تہوں سے غلے اور پھل کیوں پیدا کئے، آخر وہ اس نظام کو کیوں چلا رہا ہے — ؟''

وہ شاید جان بوجھ کر رک گئے، کچھ لوگ تو شروع ہی سے بے چین دکھائی دے رہے تھے، ان کی بے چینی میں اضافہ بھی ہوا تھا، ان کی باتوں سے وہ متفق نہیں تھے، یہ چیز ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں — ؟''

نوجوان کی آواز بھی تیکھی تھی اور نگاہیں بھی۔ معمر شخص نے اپنے لہجے کی شگفتگی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا اور سمجھانے کے انداز میں گویا ہوئے۔

''ساری باتیں صاف ہیں، صرف ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور غور کرنے کا ہمیں بار بار حکم دیا گیا ہے۔ ساری باتوں کو ان کے تناسب میں رکھ کر غور کیا جائے تو یہ بات صاف سمجھ میں آتی ہے کہ اس دنیا کو، خدا نے بے مقصد ہرگز نہیں بنایا، اس کی بنائی ہوئی دنیا میں امن و امان سے رہنا اور دوسروں کو رہنے دینا، اس کی خوصورتی اور دلکشی کی حفاظت کرنا اور اس کے سارے تقاضوں کو پورا کرنا ہماری اہم ترین ذمہ داری ہے، اس سے ہم کسی طرح پہلو تہی نہیں کر سکتے......''

ابھی ان کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ نوجوان بول اٹھا۔

''آپ کے کہنے کا مطلب ہے، مجسمہ توڑنے کی، پارک کی خوبصورتی کو برباد کرنے اور فساد برپا کرنے کی ساری ذمہ داری ہماری ہے، دنیا ہمیں مجرم کہہ رہی ہے تو ہم واقعی مجرم ہیں......؟''

ایک کھلبلی سی مچ گئی، ایسا محسوس ہوا کہ لوگ ایک مثبت سوچ کی لکیر پر چلتے چلتے اچانک لڑکھڑا گئے۔ لیکن معمر شخص نے اپنے سکون میں کوئی تبدیلی نہیں آنے دی اور پرسکون لہجے میں اپنی بات جاری رکھی، اگرچہ بات اب دوسرے رخ پر مڑ چکی تھی۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا۔ میں آپ کے جذبات کے ساتھ ہوں اور اس الزام کو اپنے سلوک اور رویے سے دھونا چاہتا ہوں۔ شاید الزام تراشیوں اور بہتان بازیوں کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ ہم جو ہر طرح سے سو چکے تھے، جاگ گئے ہیں اور ہمیں شدت سے یہ احساس ہوا ہے کہ ہم چاروں طرف سے گھیر لئے گئے ہیں......''

معمر شخص کی بات ابھی جاری ہی تھی کہ نوجوان کے چہرے کا تناؤ ختم ہو گیا اور اس نے درمیان میں ایک سوال جڑ دیا۔''

''اب آپ نے صحیح بات فرمائی ہے۔ ہمیں دشمنوں نے بے شک چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ پہلے انہوں نے ہماری انا کو چور کیا، پھر نفسیاتی طور پر احساس شکست سے دوچار کیا، ہم مضمحل ہو گئے تو ہمیں گھیر لیا۔ ہم اب بھی ان کے سامنے گھگھیاتے رہے تو یقیناً مارے جائیں گے، اب آپ ہی بتایئے کہ اس وقت ہمیں ان سے دلیرانہ مقابلہ کرنا چاہیئے یا چپ چاپ سرنگوں ہو جانا چاہیئے ــــ ؟''

''سوال اچھا ہے ــــ ''معمر شخص نے جواب دیا۔

''میرے عزیز اصل چیز تو یہی غور کرنے کی ہے۔ ہم ان کے اشتعال دلانے پر متحرک ہو جاتے ہیں تو یہ ان کی جیت ہے اور ہماری شکست اور اگر ہم انہیں نظر انداز کرتے ہیں اور اپنے کریکٹر کو اور مضبوط بنانے کی سعی کرتے ہیں تو یہ ہماری فتح اور ان کی شکست......''

وہ خاموش ہوئے تو جیسے پوری محفل پر خاموشی سی طاری ہوگئی۔ وہ نوجوان جو ایک مورچے کو تنہا سنبھالے ہوئے تھا، وہ بھی سر جھکائے کچھ سوچتا رہا، پھر سر اٹھا کر بولا۔

''آپ جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے مجھے انکار نہیں ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ بہت ہی لمبا مرحلہ ہے اور اسے طے کرتے کرتے ہم کہیں بالکل ختم ہی نہ ہو جائیں......''

معمر شخص کے چہرے پر فتحیابی کی ایک موہوم سی سرخی ابھری، مگر اس نے کمال ہوشیاری سے اسے اپنے اندر چھپا لیا اور اپنے مخصوص روایتی، سادے اور ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

''دیکھو بیٹا! اس قسم کی سوچ ہمیشہ منفی ہوتی ہے اور کسی کام کے شروع میں ایسی سوچ نہایت مہلک ہے۔ جو بات تم نے کہی، وہ مچھر، مکھی اور جانوروں کے لئے کہی جاتی ہے، کروڑوں انسانوں کو جو دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں، انہیں صف ہستی سے مٹا دینے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ کچھ مخصوص، پہلے سے طے شدہ علاقوں میں ظلم کے پہاڑ توڑے جائیں اور دو چار لاکھ آدمیوں کو مار ڈالا جائے۔ یہی ہو رہا ہے اور یہی ہوگا اور یہ جب بھی ہوا ہے اور جب بھی ہوگا اس میں غلطی کی بنیاد وہاں کے مقامی لوگوں ہی نے ڈالی ہوگی۔ تم تاریخ اٹھا کر دیکھ لو......''

''تاریخ یہ بھی تو بتاتی ہے حضور کہ ہمیں غلط الزامات سے یوں لاد دیا گیا کہ ہم اپنی صفائی دینے کے لائق بھی نہیں رہے اور صرف اپنی جان بچانے کی سعی میں لگ گئے۔ ابھی دیکھئے، مجسمہ کو نقصان پہنچایا گیا، یہ گھناؤنا کام کس نے کیا، آج تک پتہ نہیں چلا، ہماری تاریخ، روایت اور مذہب سے جوڑ کر یہ الزام نہایت آسانی سے ہمارے سر منڈھ دیا گیا اور اس کیلئے ہمارے اندرونی معاملات تک رسائی کے دروازے کھول دئے گئے۔ جب کہ سرِ عام ہمیں دھوپ میں آئینہ دکھایا گیا تو وہ آج تک اس بات کا مذاق اڑا رہے ہیں......''

ایک دوسرے نوجوان نے، جو ابھی تک خاموشی سے سب کی باتیں سن رہا تھا، پہلی بار اپنی زبان کھولی۔

معمر شخص نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''آپ نے جو کچھ کہا، اس کی سچائی سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا ہے، میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ ہمیں نہایت سنجیدگی سے یہ سوچنا ہے کہ اس وقت ہمیں کیا کرنا چاہئے، بے شک ہم گھیر لئے گئے ہیں لیکن کیا ہمارے راستے بالکل بند ہیں ___؟ بات یہ ہے بھیا کہ ہم تو چپے چپے پر پھیلے ہوئے ہیں، کہیں کم، کہیں زیادہ، کہیں بہت کم، کہیں بہت زیادہ۔ جہاں ہم زیادہ ہیں وہاں اپنے آپ کو بہت زیادہ مضبوط سمجھتے ہیں، جہاں کم ہیں وہاں بہت بے بس و مظلوم۔ جہاں ہم زیادہ ہیں وہاں ہم جا و بیجا انداز میں اپنے غصے کا اظہار کر لیتے ہیں، یہ سوچے بغیر کہ جہاں ہم بہت کم ہیں، انہیں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے......''

''آپ کی بات لمبی ہوتی جا رہی ہے اور ہماری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی......''

داڑھی والے نوجوان نے اکتائے ہوئے لہجے میں معمر شخص کی بات کاٹی۔ معمر شخص مسکرایا۔

''ذرا صبر کرو بیٹے۔ صبر ہمارا ایک ایسا ہتھیار ہے جسے بار بار اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، میری بات شاید اس لئے طویل ہوگئی کہ میں ذرا کھول کر اپنی بات کہنا چاہتا تھا۔ خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم پر اس وقت بہت نازک وقت آ پڑا ہے۔ اتنا نازک کہ شاید ایسا وقت ہم پر کبھی نہیں آیا۔ اس لئے ہمیں بہت ہوش و حواس سے کام لینے کی ضرورت ہے......''

''آپ صاف صاف بتائیے ہمیں کرنا کیا چاہئے ___؟''

نوجوان کے صبر کا پیمانہ شاید لبریز ہو چکا تھا، اس نے پھر اکتا کر معمر شخص کی بات کاٹ دی۔

''دیکھو بیٹا ___!'' معمر شخص خاصا سنجیدہ ہو گیا۔ ''ہمیں کسی حال میں بھی مشتعل نہیں ہونا ہے۔ اس سے ہماری کمزوری ظاہر ہوتی ہے اور ہمارے خلاف ان کا یہ سب سے کارگر حربہ ہے۔ صبر کے ساتھ ہمیں نہایت مضبوطی سے اپنے کردار پر جم جانا چاہئے۔ بہت ممکن ہے، محض اس کمی کے باعث ہم میں سے کچھ لوگ گمراہ ہو گئے ہوں اور ایسی حرکتیں کر بیٹھے ہوں جن سے ہمارا سر جھک گیا، ہمیں ایسے لوگوں کی بے گناہی پر بھی اصرار نہیں

کرنا چاہئے اور ہر حال میں قانون کا احترام کرنا چاہئے......"

بولتے بولتے معمر شخص نے محسوس کیا کہ شاید اس کا انداز کچھ زیادہ ہی نصیحت آمیز ہو گیا ہے اور حاضرین میں سے بیشتر پر، جو یوں بھی تعداد میں کم تھے، مثبت اثر نہیں ہو رہا ہے، پھر بھی اتنا ضرور تھا کہ وہ کچھ لوگوں کے چہرے پر صاف اپنی باتوں کی تحریر پڑھ سکتا تھا۔

یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی کہی ہوئی باتیں کوئی نئی نہیں ہیں، سینکڑوں برسوں سے سنی سنائی ہیں، بیشمار بار کانوں میں پڑی ہیں، کچھ لوگوں نے ان باتوں کو سمجھنے کی کوششیں ضرور کیں، لیکن زیادہ نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا۔ فرق یہ ہے کہ ابھی حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ زیادہ لوگ اس قسم کی باتوں کو سننے اور ان پر غور کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں، پھر بھی انہیں سمجھنے، سوچنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے وقت درکار ہوگا......

چنانچہ وہ چپ ہو گیا۔

وہ بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔

اس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں، اک سوچنے کے سوا۔ کرنے کو تو اس کے پاس پہلے سے بھی کچھ نہیں تھا۔

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک وسیع و عریض صحرا کے اکتا دینے والے سفر سے لوٹا ہے۔ ایک بے آب و گیاہ صحرا...... دور دور تک بالو کے چمکیلے، نکیلے، بے رحم دانے...... کہیں کوئی سایہ نہیں، اوپر سورج کی سرخ، چمکتی ہوئی ٹکیہ، نیچے تپتے ہوئے بالوؤں کا اتھاہ سمندر...... کہیں کہیں سراب کی چمک دکھائی دے جاتی تو خشک ہونٹ اور بے تاب قدم ادھر دوڑ جاتے، پر وہاں پانی کا نام و نشان نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ بس سراب ہی ہوتے، اگر چہ اس کے پاس زادِ راہ کے نام پر کوئی چیز نہیں تھی، بس ایک بوسیدہ، دبیز فائل جس میں دنیا بھر کے کٹے پھٹے پرزے، کرم خوردہ لکھے، ادھ لکھے کاغذ پڑے تھے جنہیں ضرورت اور وقت

کے مطابق جوڑ جوڑ کے گمشدہ تاریخ کے صفحات کی شکل دے دی جاتی تھی۔ وہ اس فائل کی جی جان سے حفاظت کرتا تھا، ہمیشہ سینے سے چمٹائے رکھتا، جب بھی اس پر کوئی افتاد پڑتی جس کا کوئی مدوا نہیں ہوتا اور وہ ہر چہار طرف سے پتھریلی دیواروں سے سر پٹک پٹک کر مایوس ہو جاتا تو انہیں بوسیدہ کاغذوں کی پرانی بو سے اسے ایک گونہ سکون نصیب ہوتا۔ وہ گھنٹوں ان کرم خوردہ کاغذوں کے پنے پنے کو جوڑتا اور بہت محنت کے بعد انہیں کسی حد تک ترتیب دے پاتا۔ اس ترتیب سے اسے جو معلومات حاصل ہوتیں، وہ اسے بیحد سکون پہنچاتیں، ان معلومات کے ذریعہ وہ کبھی کبھی اپنی پہچان تک جا پہنچتا۔ اگرچہ اس حاصل شدہ پہچان سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا، پھر بھی اس کے اعصاب اور جذبات پر جو خوشگوار پھواریں پڑتیں، وہ اسے پھر سے توانا بنا دیتیں اور وہ کافی حد تک اپنی خارجی دنیا سے مقابلہ کرنے کے لائق بن جاتا۔ شاید یہ توانائی اسے نہیں ملتی تو وہ کب کا مر کھپ جاتا اور اس کی داستان بھی نہ ہوتی داستانوں میں۔

اکثر لوگ، فائل کو اس کے سینے سے چمٹا دیکھ کر، اس کا مذاق بھی اڑاتے، ان کے ہاتھوں میں اس وقت ایسے رنگ برنگے بیلون ہوتے جن سے ان کے چہروں پر خوشیاں کھیلتی رہتیں۔ یہ بیلون کبھی کبھی ان کے ہاتھوں سے چھوٹ بھی جاتے، کبھی وہ خود ہی انہیں آسمانوں میں چھوڑ دیتے۔ دونوں حالت میں انہیں کچھ کھونے کا ہرگز احساس نہیں ہوتا بلکہ کچھ پانے کی سرشاری ان پر طاری رہتی۔ اس کی بھی خواہش ہوتی کہ وہ بھی ان رنگ برنگے بیلون کو حاصل کرے اور کبھی کبھی انہیں آسمانوں میں چھوڑنے کی سرشاری وہ بھی محسوس کرے۔ لیکن اسکے ساتھ مجبوری یہ تھی کہ وہ اپنی فائل کو اپنے سے کسی قیمت پر جدا نہیں کر سکتا تھا اور ایسا کئے بغیر بیلون کو اپنی گرفت میں لینا ممکن نہیں ہوتا۔

وہ سوچتا رہا...... اس نے اپنا سفر کہاں سے شروع کیا تھا۔ بہت سی باتیں گڈمڈ ہو کر اس کے ذہن میں ناچتی رہیں، مگر کسی ایک نتیجے پر پہنچنے سے وہ قاصر رہتا۔ پھر اسے اتنا تو یاد

تھا ہی کہ وہ سڑک پر جا رہا تھا کہ کسی نے بھری دھوپ میں اسے آئینہ دکھا دیا۔ اس کی چمک نے اس کے اندر اور باہر کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا۔ ایک بار کی بات ہوتی تو اسے خود اتفاق مان لینے میں تامل نہیں ہوتا۔ بار بار آئینہ دکھایا گیا تو فطری طور پر اس کے ذہن میں یہ بات کوندگئی کہ یہ چیز جان بوجھ کر کی جا رہی ہے۔ اس کا مقصد اسے ذلیل کرنے اور تکلیف پہنچانے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے اس کے خلاف آواز بلند کی، اپنے پرائے کے پاس فریاد لے کر گیا، کچھ نے اس کی شکایت ایک کان سے سنی، دوسرے سے اڑا دی۔ بہر کیف کچھ ایسے ضرور تھے جو اس سے مشتعل ہوئے اور انہوں نے مجرم کو پکڑنے اور اسے قرار واقعی سزا دلانے کی کوشش کی۔ ان کی کوششیں اس حد تک ضرور بار آور ثابت ہوئیں کہ ان کی مہم میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوتے گئے اور اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ دوسری طرف کے لوگوں نے کہا کہ مجرم کی نشاندہی کرو، اسے پکڑ کر لاؤ، بس معاملہ یہیں ٹھہر گیا۔ اسے آگے لے جانے یا پیچھے لے جانے کی ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ مجسمہ کو نقصان پہنچایا گیا لیکن یہ بات یا یہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی کہ آخر وہ کون تھے جنہوں نے اس گھناؤنے کام کو انجام دیا لیکن ایک قوم کی روایت اور تہذیب کو بنیاد بنا کر سب کے سب کٹہر ے میں کھڑے کر دئے گئے، اس بہانے، وہ تمام تصورات، خیالات و جذبات اچانک ابھر کر سامنے آ گئے جو نہ جانے کب سے دلوں اور دماغوں کی بھٹیوں میں پک رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ بس کسی ایک اشارے، کسی بہانہ اور کسی نامعلوم ٹھوکر کے منتظر تھے۔ ان کی آمد کا بہاؤ اس قدر تیز تھا کہ ایک ریلے کی شکل میں باہر آیا اور ساری جمی جمائی چیزوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا۔ اس نے گھروں کے کونے کونے کو چھان مارا اور سیدھی نگاہوں میں آنے والی ساری چیزوں کو دنیا بھر کے معنی پہنا کر بے شمار مفروضے تیار کئے گئے۔ کچھ دکھائی دینے والا اور زیادہ نہ دکھائی دینے والے...... حملہ اتنا شدید تھا کہ زد میں آئے سارے کے سارے لوگ بوکھلا

اٹھے۔ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کھائیں کدھر کی چوٹ، بچائیں کدھر کی چوٹ۔
کسی فرد پر کبھی کوئی نفسیاتی حملہ ہوتا ہے تو وہ اسے اپنی ذات کے حصار میں جھیل لیتا ہے اور کامیابی وناکامی کا سارا معاملہ اس کا اپنا ہوتا ہے۔لیکن یہاں صورت حال یہ تھی کہ ایک پوری کی پوری قوم ایک عجیب نفسیاتی گتھی میں الجھ گئی تھی۔طرح طرح کے زاویے، قسم قسم کے نظریے......کوئی کہتا ہاں ہم ویسے ہی ہیں جیسا کہ ہم کو کہا جا رہا ہے اور ہم جب ہم ایسے ہیں تو پھر دوسرے کو کیا......؟
کوئی کہتا غلط الزام کی صلیب سینے سے لگا کر ہم کیوں جئیں، کیوں کر الزام کے جوے کو کس طرح اپنے گلے سے اتار پھینکیں۔کوئی کہتا ہمیں ایک سازش کے تحت پھنسایا گیا ہے۔جس کا سرا تاریخ کے ان گم شدہ صفحات میں پوشیدہ ہے، جنہیں تحریری شکل میں نہیں لایا گیا لیکن جو تحریری شکل میں ہر دل کے نہاں خانے میں رقم ہے۔
کوئی کہتا ہمیں لڑتے لڑتے جان دے دینی چاہئے لیکن انکے سامنے اپنا سر نہیں جھکانا چاہئے۔
وہ لکھتے لکھتے تھک گیا تو اس نے اپنا قلم ایک طرف رکھ دیا۔بوسیدہ کاغذات سمیٹ لئے جو لکھے جانے کے سبب جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور انکی شکل عجیب مسخ شدہ سی ہوگئی تھی۔
اس نے کچھ دیر آرام کی خاطر اپنی آنکھیں موندلیں۔
آنکھیں کیا موندیں کہ اس کے اندر کی بے شمار آنکھیں کھل گئیں۔غنیمت تھا کہ اس کے اندر کی آنکھیں ابھی تک اس کی اپنی ہی تھیں اور اس کے اندرون ہی کو دیکھتی تھیں۔
اصل مسئلہ بیرونی تھا۔وہ اپنی بے شمار کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ سارے پردے اٹھا دئے گئے ہیں اور وہ اپنے مال واسباب کے ساتھ سڑک پر کھڑے کر دئے گئے ہیں جہاں ہر ایک تجسس بھری نگاہیں ان کے اسباب کو دیکھ رہی ہیں، پرکھ رہی ہیں اور اپنی اپنی سوچ کے مطابق ان کی قیمت لگا رہی ہیں۔کچھ نگاہیں ایسی بھی ہیں جو قیمت لگانے کو بھی تیار نہیں۔ان نگاہوں میں حقارت ہی حقارت ہے، نفرت ہی نفرت......ساری چیزیں ان

کی نگاہوں میں کوڑا ہیں وہ اپنی اپنی راکھ کریدنے کے سوا اور کچھ نہیں کرنا چاہتیں۔
کچھ نگاہوں میں برسہا برس سے جما جمایا وہ تجسس ختم ہو چکا ہے جو ان کے لئے مسلسل بیدار رہتا تھا۔ تجسس کے تانے بانے کبھی بہت اونچائی پر لے جاتے، کبھی اتنی گہرائی میں پھینکتے کہ ڈھونڈے سے نظر نہیں آتے۔ وہاں اب چاروں طرف صرف احساس کی وہ بنجر زمین ہے جو سارے بھرم سے خالی اور حقارت سے پر ہے۔ کچھ نگاہوں میں افسوس ہے۔ ان کے لئے بھی اور شاید اپنے لئے بھی۔ ان کے لئے اس لئے کہ انہوں نے انہیں کیا سے کیا سمجھ رکھا تھا اور وہ کیا نکلے۔
کچھ نگاہوں میں اطمینان کہ چلو ان کے سارے رازوں سے پردے تو اٹھے اور ان کی اصل حقیقت سامنے تو آئی۔
لیکن کچھ نگاہیں ایسی بھی تھیں جو بھُس میں آگ کی چنگاری کے وجود پر یقین رکھتی تھیں۔ ان کے لئے کوئی چیز بھی غیر اہم نہیں تھی۔ ہر چیز جو انہیں سامنے دکھائی دیتی، اس میں انہیں کوئی دوسری تصویر دکھائی دیتی تھی۔ اس تصویر کا بھی کوئی ایک رخ نہیں تھا، اپنی اپنی سمجھ اور صواب دید کے مطابق بے شمار رخ......

کچھ نگاہیں ایسی تھیں جو راکھ کے ڈھیر کو بھی یکسر ختم کر دینا چاہتی تھیں کیوں کہ وہ سمجھتی تھیں کہ راکھ کے پردے سے بھی ضرور ایسا وجود نکلے گا جو دنیا کو تاراج کرنے کی کوشش کرے گا۔
غرض جتنی نگاہیں اتنے ہی معنی، اتنے ہی ارادے، اتنے ہی عزائم، اتنی ہی سوچ......
دوسری طرف صورت حال یہ کہ بھرم کے جس موہوم تار نے انہیں برسہا برس تھامے رکھا تھا اور پل صراط پر بھی انہیں قائم و دائم رکھنے کی کوشش کی تھی، وہ تار ایک ہی جھٹکے میں ٹوٹ گیا تھا۔ جس پردے نے ان کا تاریخی بھرم بنائے رکھا تھا، جس میں چھپ کر وہ اپنے آپ

کو بیحد محفوظ سمجھتے تھے، وہ اچانک کھینچ لیا گیا تھا۔ دکھائی یہ دے رہا تھا کہ اس پردے میں کتنے سوراخ ہیں اور وہ پردہ کس قدر تار تار ہے۔ اس میں کسی بھرم کو قائم رکھنے چھپانے یا کسی کو محفوظ رکھنے کی بالکل صلاحیت باقی نہیں بچی تھی۔ دور دور تک ایک سنگلاخ زمین تھی اور حد نظر تک صحرا ہی صحرا بکھرا ہوا تھا۔

اس نے گھبرا کر جلدی سے اپنی آنکھیں کھولیں۔ ویسے بھی ان آنکھوں میں اب نہ نیند بچی تھی نہ چین۔ ایک غیر ارادی لاشعوری عمل تھا جس کے تحت آنکھیں بند ہوتی تھیں، کھلتی تھیں۔ اس سے زیادہ شاید ان کا کوئی مصرف ہی نہیں تھا اس نے اپنے ادھ کھلے، ناپختہ، کچی پکی تحریروں پر مشتمل کاغذات کو ترتیب دینے کی کوشش کی، مگر اس کا بالکل الٹا ہی اثر ہوا۔ حالانکہ صفحات بہت زیادہ نہیں تھے۔ چند ہی اوراق تھے لیکن وہ اس قدر سرکش تھے کہ کسی طرح قابو ہی میں نہیں آتے تھے وہ انہیں ترتیب دینے کی جتنی کوشش کرتا، اتنا ہی وہ الجھتے جاتے۔ کبھی اوپر کا صفحہ نیچے چلا جاتا، کبھی نیچے کا درمیان میں، کبھی سارے اوراق یوں گڈ مڈ ہو جاتے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون ورق کہاں چلا گیا اور ترتیب میں اسے کہاں رکھا جائے۔

اس کوشش میں اسے کافی دیر ہوگئی اور وہ بہت پریشان ہوگیا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کچی پکی تحریروں کو صفحہ قرطاس پر اتارنا، انہیں ایک پلندے کی شکل دینا، پھر انہیں سینے سے لگائے رکھنا، اس کا بیحد محبوب مشغلہ تھا اور یہی مشغلہ اسے ابھی تک متحرک رکھے ہوئے تھا۔ لیکن ابھی اسی کے کھلے ہوئے اوراق اسے یوں پریشان کئے ہوئے تھے کہ ان پر اس کا اختیار بالکل ختم ہوگیا تھا اور انہیں ترتیب دینے کی ساری کوششیں رائگاں ہو رہی تھیں۔

اچانک اسے خیال آیا کہ غلطی تو دراصل اسی کی ہے۔ اس نے کسی ورق پر نمبر ہی نہیں ڈالا، اسلئے تحریروں کو ایک تسلسل میں جوڑنا اتنا کٹھن ثابت ہوا۔ وہ شروع ہی میں اس کا خیال رکھتا تو یہ مشکل شاید اسے ہرگز پیش نہیں آتی۔ وہ بڑی آسانی کے ساتھ نیا پلندہ ترتیب

دے لیتا۔ مگر اب تو سارے اوراق یوں پریشان تھے کہ انہیں سلجھانے کی کوئی صورت نظر ہی نہیں آتی تھی، سو سلجھانے کی جتنی کوشش کرتا، وہ اور الجھتے ہی جاتے۔ تنگ آ کر اس نے یہ کوشش ہی چھوڑ ہی دی کہ اب اسے قسمت ہی پر بھروسہ کرنا تھا۔

اس نے کانپتے ہوئے مایوس ہاتھوں سے پریشان اوراق کا پلندہ بنایا، اسے بڑے پلندے کے ساتھ منسلک کیا، انہیں ایک فائل میں بند کیا، فائل کو بغل میں دبایا اور چل پڑا۔

کہاں......؟

یہ تو اسے معلوم ہی نہیں تھا۔ وہ بس چل پڑا تھا۔ غنیمت بس یہ تھی کہ اس کے سامنے حد نظر تک راستہ پسرا ہوا تھا اور اس پر بہت دیر اور دور تک چلا جا سکتا تھا۔ کم سے کم اس وقت تک تو یقیناً جب تک ہمت جواں رہے، پاؤں ساتھ دیں اور راستہ ختم نہ ہو۔

■■

عبدالصمد کی دیگر تصانیف

ناول

☆ دو گز زمین ۱۹۸۸
☆ مہاتما ۱۹۹۲
☆ خوابوں کا سویرا ۱۹۹۴
☆ مہاساگر ۱۹۹۸
☆ دھمک ۲۰۰۴

افسانوں کے مجموعے

☆ بارہ رنگوں والا کمرہ ۱۹۸۰
☆ پس دیوار ۱۹۸۳
☆ سیاہ کاغذ کی دھجیاں ۱۹۹۵
☆ میوزیکل چیر ۲۰۰۲
☆ آگ کے اندر راکھ ۲۰۰۷

دیگر

☆ قومی تحریک اور ہندوستانی آئینہ (اُردو) ۱۹۸۵
☆ Muslim Mind in India (انگریزی) ۱۹۹۵

BIKHRE AURAAQ
(Novel)
by
Abdussamad
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com
978-81-8223-684-4